اسلامی اور مغربی اُصول قانون کے نظریات کا ایک تقابلی جائزہ

Theories of Jurisprudence
(A Comparative Review of Islamic and Western Ideas)

میمونہ یاسمین (1)

ABSTRACT

The western has many theories of jurisprudence such as:

1. Imperative theory of law
2. Historical theory of law
3. Sociological theory of law
4. Natural theory of law

Western legal theory focuses on what the judge actually does, while Islamic legal theory focuses on what the judge should do.(2) Islam has only one theory of jurisprudence which is pure and eternal it shows the authority and greatness of Allah Almighty. Islamic theory of jurisprudence is comprehensive and final.

Islamic jurisprudence is the queen of Islamic sciences. It has been developed, refined, and applied for the derivation of the law by some of the greatest Muslim minds, throughout the ages.(3)

Key Words: Jurisprudence, Theories, Imperative, Historical, Sociological, Natural, Islamic

1۔ قانون اور اُصول قانون کی وضاحت

الف۔ قانون اور اُصول قانون کا مغربی تصور

---

(1) میمونہ یاسمین، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین، ڈھوک الٰہی بخش، راولپنڈی۔

(2) Nyazee, Imran Ahsan Khan, Theories of Islamic Law, Islamabad: Islamic Research Institute, 1991, P.30.

(3) Ibid, P.1.

انگریزی میں قانون کے لیے Canon [4]، Law اور زیادہ تر Jurisprudence کے الفاظ معنی "Skill in the Law" [5] اور "Knowledge of Law" کے استعمال ہوتے ہیں اہل مغرب قانون کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ اہل مغرب قانون کی تعریف مختلف الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ جیسا کہ مغربی مفکر سالمنڈ Salmond [6] نے قانون کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"The law may be defined as the body of principles recognised and applied by the state in the administration of justice, In other words, the law consists of rules recognised and acted on by the courts of justice".[7]

(قانون ان اصول و قواعد کے مجموعے کا نام ہے جو ریاست یا مملکت اپنی حکومت میں عدل وانصاف قائم رکھنے کی خاطر منظور کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر قانون ان اصول و قواعد پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو عدالت ہائے انصاف کے نزدیک مسلمہ ہوں اور جن پر یہ عدالتیں عامل ہوں۔)

جبکہ ہالینڈ کے مطابق اہل مغرب اُصول قانون Jurisprudence کی جامع تعریف اس طرح کرتے ہیں:

"Jurisprudence is the (Formal) Science of Positive law".[8]

یعنی (اصول قانون، مثبت قانون سازی کی باقاعدہ سائنس کا نام ہے)

مغربی اصول قانون کی تمام تعریفوں میں سے ہالینڈ Holland) کی تعریف سب سے زیادہ آسان اور عام فہم ہے لیکن ان کا لب لباب یہ ہے کہ Jurisprudence صرف انسان کے وضع کردہ قانون کے بنیادی اُصولوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا علم ہے۔

---

(4) Canon: یہ وہ اصول وضوابط ہیں جو مذہب کے نام پر اہل چرچ نے بنا رکھے تھے۔ Curzon, L.B, A Dictionary of Law, (Mc Donald and Evans, 1979), P.45

(5) Dias, R.W.M, Jurisprudence, (Butterworths, London, 1985), Ed:5th, P.3

(6) سالمنڈ، سر جان (۱۸۶۲-۱۹۲۴ء) نیوزی لینڈ کا ماہر قانون دان اور جج جو قانون کا پروفیسر بھی۔ ۱۸۸۲ء میں یونیورسٹی کالج آف لندن سے گریجویشن کی اور ۱۸۸۷ء میں واپس نیوزی لینڈ لوٹا۔

(ii) (i) Chambers Biographical Dictionary, (Melanic Parry, (Encylopedia of Newzeeland, (Mc. Lintok, A.H, 1966 Edinburgh, 1997), p. 1626

(7) Salmond, Sir John, Jurisprudence, (London, 1946), Ed: 10th, P.41

(8) Holland T.E, The Elements of Jurisprudence, (Oxford University Press , London), Ed: 3rd, P.8

ب۔ اسلامی قانون کی اصطلاح 'فقہ اور اُصولِ فقہ' سے مراد:

علامہ محمد علاؤ الدین الحصکفیؒ نے معروف اصطلاح فقہ کی تعریف اس طرح بیان کی ہے:

''ھو العلم بالاحکام الشرعیة الفرعیة المکتسب من ادلتھا التفصیلة'' [9]

''وہ ایسے احکام شرعیہ فرعیہ کا جاننا ہے جو اپنے ادلّہ تفصیلہ سے حاصل کیے گئے ہوں۔''

احادیث میں بھی یہ لفظ شرعی احکام کے فہم کو حاصل کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ''اُصولِ فقہ'' سے مراد وہ امور ہوں گے جن پر فقہ اور اس کے احکام کا دارومدار ہو، جن کی مدد سے فقہی مسائل کے صحیح یا غلط ہونے اور فقہی آراء و اجتہادات کے قابل قبول ہونے یا نا قابل قبول ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔ [10] جمہور علمائے حنفیہ، مالکیہ اوز حنابلہ کے مطابق اُصولِ فقہ سے مراد:

''انہ علم بقواعد یتوصل بھا المجتھد لاستنباط الاحکام الفقھیة من ادلتھا التفصیلیة'' [11]

البیضاویؒ [12] کے مطابق اُصول فقہ سے مراد ہے:

''معرفة دلائل الفقه اجمالاً و کیفیة الاستفادة منھا وحال المستفیں'' [13]

اس تعریف کے مطابق ''اُصول فقہ'' سے مراد ہے ''العلم بالادلة'' اس طرح کا قول قاضی الباقلانیؒ [14] اور ابن الحاجبؒ [15] امام الآمدیؒ [16] اور الشیرازیؒ [17] اور علامہ الشاشیؒ [18] سے بھی منقول ہے۔ اور اصول فقہ کی تعریف سے

---

(9) الحصکفیؒ، علاؤ الدین محمد بن علی بن محمد، الدرالمختار، (مصر: س۔ن) ص:۱۱/ ۲۸ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:

(i) الآمدیؒ، ابو الحسین سیف الدین علی بن محمد، الاحکام فی اُصول الاحکام (قاہرہ: دارالمعارف، ۱۹۱۴ء)، ص:۱/ ۴۔

(ii) الشلبیؒ، محمد مصطفیٰ، المدخل فی التعریف بالفقہ الاسلامی، (بیروت: دار النہضة العربیة، ۱۹۴۹ء)، ص:۳۲۔

(10) غازی، محمود احمد، علم اُصول فقہ ایک تعارف (اسلام آباد: شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، ۲۰۰۲ء)، ص:۱/ ۲۳

(11) البدخشانیؒ، محمد انور، اُصول الفقہ للمبتدئین، (کراچی: مکتبہ الیمان، س۔ن)، ص:۲۴

(12) البیضاویؒ: ناصر الدین ابو الخیر عبد اللہ، بن عمر بن محمد (م ۶۸۵ھ/ ۱۲۸۶ء یا ۶۹۲ھ/ ۱۲۹۲ء) ایک مشہور شافعی عالم دین اور مفسر بیضا میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ایک تفسیر ''انوار التنزیل واسرار التاویل'' کے نام لکھی جو معروف ''تفسیر البیضاوی'' کے نام سے ہے۔ (الکحالہؒ، م۔ن، ص:۳ / ۴۵، ص:۶ / ۹۷)

(13) شرح المنہاج للاصفہانیؒ، ص:۱/ ۳۳، بحوالہ الشافعیؒ، ابو عبد اللہ محمد بن ادریس، الرسالة، (بیروت، لبنان: دارالکتاب العربی، ۱۹۹۹ء)، ص:۶

(14) الباقلانیؒ: محمد بن طیب بن جعفر باقلانی (۳۳۸ھ/ ۹۵۰ء۔ ۴۰۳ھ/ ۱۰۱۳ء) ایک بہت بڑے علم دین اور علم الکلام کے ماہر بصرہ میں پیدا ہوئے۔ حنبلی مسلک سے تعلق تھا۔ اشاعرہ میں ان کو اونچا مقام حاصل تھا۔ (الکحالہؒ، م۔ن، ص:۱۰ / ۱۰۹)

یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس علم میں تمام مسائل اور مباحث کا اجمالی نقشہ سامنے آتا ہے اور واضح ہوتا ہے کہ علم اصولِ فقہ کا ہر مسئلہ، گویا کہ ایک قاعدہ ہوگا، جس کے ذریعے سے ہم کسی حکم شرعی کو دلیل تفصیلی سے معلوم کرسکتے ہیں۔ لیکن اُصول فقہ کی تعریفوں سے پتہ چلتاہے کہ اصولِ فقہ کا انحصار ان تین اُمور سے معرفت حاصل کرنا ہے:

الف۔ دلائل الفقہ الاجمالیة ب۔ کیفیة الاستفادة منها ج۔ حال المستفید [19]

غرض ایسے طریقے اور مناہج اور قواعد جو فقہی احکام کے اخذ کرنے اور ان کے دلائل فراہم کرنے میں مدد دیں، ''اُصولِ فقہ'' کہلاتے ہیں اور اس علم کو ''علم اصول الفقہ'' کہاجاتا ہے۔[20]

ج۔ تقابلی جائزہ:

اہل مغرب قانون سے مراد ایک مربوط و منظم معاشرے میں عدل وانصاف کے قیام کی غرض سے ایک مقررہ اور طے شدہ ضابطے کو لیتے ہیں، جبکہ اسلامی تصور کے مطابق اس سے مراد حکم الٰہی ہے اور اسلامی فقہاء کے مطابق وہ مجموعہ قواعد وضوابط ہے جو قرآن وسنت اور اجتہاد شرعیہ پر مبنی ہو۔ مغربی نکتہ نظر سے اُصول قانون (Jurisprudence) سے مراد وہ

---

(15) ابن الحاجبؒ: جمال الدین ابو عمرو عثمان بن عمر الکردی (۵۷۱ھ۔۶۴۶ھ)، عربی کا مشہور نحوی اور فقیہہ مصر میں پیدا ہوا، متعدد کتب لکھیں۔ (i) الکحالہؒ، م۔ن، ص:۶ / ۲۶۵

(16) الآمدیؒ: علی بن ابی علی بن محمد التغلبی سیف الدین (۵۵۱ھ۔۶۳۱ھ) عراق کے شہر آمد میں پیدا ہوئے۔ مشہور عالم دین، فلسفی تھے۔ اصول دین پر کتاب، احکام الحکام، تحریر کی۔

(i) خلیفہ، مصطفی بن عبداللہ، کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، (بیروت، لبنان: داراحیاء التراث العربی، س۔ن)، ص:۲۴۷ (ii) ابن حجر، الدرا لکامنة، ص: ۳ / ۲۱ (iii) ابن الندیم، محمد بن اسحاق، الفہرست، (بیروت، لبنان: مکتبة خیاط، س۔ن)، ص:۲۵۵

(17) الشیرازیؒ: محمد بن یعقوب بن ابراہیم بن عمر مجد الدین الشیرازی کا شمار آئمہ لغت وادب میں ہوتا ہے۔ ان کی مشہور کتاب ''القاموس المحیط'' ہے، (الزرکلیؒ، م۔ن، ص:۷/۱۴۶)

اُصولِ فقہ کی تعریف کے لیے مزید دیکھئے: (i) ابن النجیمؒ، فتح الغفار شرح المنار محلاوی تسہیل الوصول لی علم الاصول، (مصطفی البابی الحلبی، مصر، س۔ن)، ص: ۱ (ii) الرازیؒ، م۔ن، ص:۵۰۹

(iii) الزرکشیؒ، بدر الدین محمد بن بہادر بن عبداللہ (م۷۹۴ھ)، البحر المحیط فی اصول الفقہ، (بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیة، ۱۴۲۱ھ)، ص:۱ / ۱۷۔۱۸

(18) الشاشیؒ سمرقندی نظام الدین اسحاق بن ابراہیم (م۳۲۵ھ یا ۹۳۷ء): فقیہ حنفی، مصر میں قاضی القضا کے منصب پر فائز رہے، '' اصول الفقہ'' معروف ہے۔ (الزرکلیؒ، م۔ن، ص:۳۶۵)

(19) حسّان، حامد حسین، اصول فقہ (اسلام آباد: دارالصدق، ۱۹۹۹ء)، ص:۱۰

(20) صدیقی، ساجد الرحمن، ڈاکٹر، کشاف اصطلاحات قانون (اسلامی)، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء) ص:۲۷

عمومی مجرد اور نظری تحقیق ہے، جس کا مقصود قانونی نظام کے ضروری اور بنیادی اُصولوں کی وضاحت اور ممیز کرنا ہو۔ مغربی تصور کے برعکس فقہ اور اُصول فقہ کا جامع اور وسیع تر مفہوم اور مقصد ہے۔ جس کو امام الکاسانی نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

> ''مغربی تصور قانون اور اُصول قانون کے مقابلے میں اسلام میں فقہ اور اُصولِ فقہ کا جامع تصور ہے۔ اور فقہ کے لفظی معنی فہم و فراست اور فکر نافذ کرنے کے ہیں یعنی ایسی بصیرت وادراک موجود ہونا، جس سے افعال واعمال کی غایت اور مقصود کا علم وشعور حاصل ہو سکے''۔[21]

الکاسانیؒ[22] کے قول کے مطابق:

''الفقه بأنه علم الحلال والحرام، وعلم الشرائع والاحکام ''[23]

اُصول فقہ سے مراد وہ قواعد ومباحث ہیں، جن کی مدد سے ادلّہ تفصیلیہ سے احکام شریعہ عملیہ کا استنباط کیا جاتا ہے۔ مختصر المفہوم یہ کہ علم فقہ (یا فقہ) سے مراد مجموعہ احکام ہے اور اُصول فقہ سے مراد احکام کے استنباط واستفادہ کے قواعد ہیں۔ فقہ کے اصول قطعی اور یقینی ہیں، ظنی نہیں ہیں، جس کی دلیل یہ ہے کہ یہ اُصول کلیات شریعت کی طرف راجع ہیں اور جہاں یہ بات پائی جاتی ہو تو ایسے اصول ہمیشہ قطعی (یقینی) ہوں گے۔[24]

اسلامی نقطہء نظر سے اُصول کا اطلاق ایسے کلیات پر ہوتا ہے جو کتاب وسنت میں صراحت سے بیان ہوئے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى)[25]

''اور کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا''

اسی طرح حدیثِ مبارکہ ہے: (لا ضرر ولا ضرار)[26] ''نہ نقصان پہنچاؤ اور نہ نقصان اٹھاؤ''

---

(21) صدیقی، ساجد الرحمن، م۔ن، ص:۳

(22) الکاسانیؒ، ابو بکر بن مسعود بن احمد، (م ۵۸۷ھ)، ملقب بملک العلماء، یہ کتاب ''البدائع والصنائع''، اور ''تحفۃ الفقہاء'' کی شرح کے موئف ہے۔ (خضری، م۔ن، ص:۳۴۸)

(23) الزحیلیؒ، الزحیلی، وحبہ، اصول الفقہ الاسلامی (کوئٹہ، پشاور: مکتبہ رشیدیہ، س۔ن)، ص:۱/۱۹

(24) الشاطبیؒ، (ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ بن محمد، الموافقات فی أصول الشریعۃ، (مصر: مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، ۱۹۷۵ء)، ص:۱/ ۴۵ تا ۴۶۶

(25) فاطر ۳۵: ۱۸

2۔ اُصول قانون کے نظریات:

ا۔ حکمی نظریہ (Imperative Theory of law):

حکمیہ قانون ان قواعد وضوابط کا نام ہے جو حکومت کی طرف سے مرتب کردہ ہوں اور عام طریقہ کاروائی کے طور پر حکومت یا طاقت اعلیٰ کی جانب سے عوام پر جسمانی طاقت کی بناء پر یا دیگر کسی طریقہ کی رو سے جبراً قابل نفاذ ہوں۔ قانون کے اس نظریے پر افلاطون(27) کے افکار نے بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ تھامس اکوائنس اور امیونل کانٹ(28) نے بھی اس سلسلے میں قانونِ جبری پر زور دیا ہے۔ لیکن جدید مفہوم کے اعتبار سے اس نظریے کو میکاولی(29)، بودین، ہابز، بینتھم(30)، ہالینڈ اور آسٹن کی تحریروں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ نظریہ انگلستان(31) اور دنیا کے دوسرے ممالک میں بہت مقبول ہوا۔ یہ فلسفہ سب سے پہلے ہابز(Hobbes)(32) نے سترہویں صدی میں پیش کیا۔ اس کے مطابق:

"Man is by nature a selfish animal; he is not a social animal."(33)

(انسان فطری طور پر ایک سماجی حیوان نہیں بلکہ ایک خود غرض جانور ہے۔)

ہابز(Hobbes) حکمیہ نظریہ قانون کے بارے میں مزید خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

"It is men and arms that make the force and power of the law."(34)

---

(26) ابن ماجہؒ، ابو عبد اللہ محمد بن یزید (م ۲۷۳ھ)، سنن ابن ماجہ، (دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، س۔ن)، کتاب الاحکام باب من بنی فی حقہ مایضر بجارہ، ح: ۲۳۴۰، ص:۲/ ۲۷۰

(27) افلاطون (۴۲۷۔۳۴۷ق م): مشہور زمانہ یونانی فلاسفر، سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: افلاطون، جمہوریہ

(28) امیونل کانٹ : (Immanual Kantt ۱۷۲۴ء۔۱۸۰۴ء): ایک جرمن فلسفی ہے۔ (اُردو جامع انسائیکلوپیڈیا)، ص:۲/ ۱۱۷۴

(29) میکاولی: (۱۴۶۹ء۔۱۵۲۷ء)، اطالوی سیاست دان اور مورخ تھا۔ (اُردو جامع النسائیکلوپیڈیا)، ص:۲/ ۱۲۷۸

(30) بینتھم جرمی: (۱۷۴۸ء۔۱۸۳۲ء): انگریز فلسفی، افادیت پسندی کا بانی اور ماہر قانون تھا۔ (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا)، ص:۱/ ۲۹۷

(31) چیمبر۔ اے، ایم، تاریخ دستور انگلستان، مترجم مولوی سید علی رضا، (دکن: جامع عثمانیہ، حیدر آباد۔ ۱۹۲۲ء)، ص:۱

(32) تھامس ہابس (۱۶۷۹۔۱۵۸۸ء) کا شمار انگلستان کے ممتاز ترین سیاسی مفکرین اور فلسفہ دانوں میں ہوتا ہے۔ پندرہ سال کی عمر میں اس نے آکسفورڈ سے گریجویشن کی۔ اس کے زمانے میں انگلستان میں مطلق العنان بادشاہت کے حامیوں اور پارلیمنٹ یعنی دستوری حکومت کے حامیوں کے درمیان زبردست خانہ جنگی ہوئی۔ اس کانہ جنگی کے دوران شاہی خاندان اور مطلق العنان بادشاہت کی حمایت میں اپنے آپ کو وقف کرکے گیارہ سال فرانس میں جلاوطنی کے دن گزارے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:
International Encyclopaedia of the Social Sciences, (New York: The Mc Millan Company, 1972.

(33) Salmond, (Glanville), Ibid, P.23

(آدمیوں (سپاہ) اور اسلحہ کے ذریعہ سے قانون کی طاقت اور قوت ظاہر ہوتی ہے۔)

جبکہ سالمنڈ ہابز کی تعریف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"Hobbes concluded that law originated neither in custom nor in the will and power of a superior." (35)

(ہابز نے نتیجہ اخذ کیا کہ قانون نہ روایات اور نہ ہی کسی طاقت کی مرضی یا قوت سے وجود میں آتے ہیں۔)

حکمیہ نظریہ کو ایجابی نظریہ بھی کہتے ہیں۔ یہ نظریہ دراصل ملکی قانون کے حکمیہ نظریہ کی شکل ہے۔ اس نظریے کی رو سے قانون ایک شعوری فعل ہے۔ قانون دراصل مقتدر اعلیٰ کی ہدایات ہیں، جن کا نفاذ جبری طریقے سے کروایا جاتا ہے۔ سالمنڈ کے مطابق:

"Imperative law means a precept or rule of action imposed upon men by some authority which enforces obedience to it. In other words, an imperative law is a command , or a rule in the form of a command."(36)

(ایسا حکم جس کو کوئی حاکم کسی کام کے کرنے کے لیے اپنی رعایا پر نافذ کرتا ہے، اور اُس کی تعمیل اُن لوگوں سے بجز کراتا ہے، قانونِ حکمیہ (یا قانون تعبدی) کہلاتا ہے، دوسرے لفظوں میں حکمیہ قانون ایک حکم اور فرمان ہے۔)

اس بات کی تائید پفنڈراف ان الفاظ میں کرتا ہے:

"Lex est decretum quo superior sibi subjectum obligate, ut ad istius prescriptum actions suas componat." (37)

(قانون ایک ایسا حکم یا امر ہے، جس کو ایک راعی اپنی رعایا کے افعال کو منضبط و باقاعدہ بنانے کی غرض سے نافذ و جاری کرتا ہے۔)

---

(34) Ibid, P.29

(35) Ibid.

(36) Salmond, (Glanville), Ibid, P.21

(37) Ibid, P.21

۲۔ جان آسٹن کا نظریہ اور قانونی حیثیت :

۱۸۲۳ءمیں جان آسٹن(John Austin) نے لندن یونیورسٹی میں چند لیکچرز دیئے اور ان کا مجموعہ "The Province of Jurisprudence, Determined"علم قانون کی حدود) کے عنوان سے شائع کیا۔ اس میں علم قانون کی حدود کا تجزیہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے کیا گیا ہے۔ وفات کے بعد آسٹن کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ وہ حکمیہ (تجزیاتی) مکتب فکر کا بانی بن گیا۔[38] جان آسٹن نے ہابز کے خیالات سے متاثر ہوتے ہوئے قانون کی تعریف اس طرح کی ہے کہ قانون:

"A command which obliges a person or persons to a course of conduct"[39]

(قانون وہ حکم ہے، جس کی وجہ سے ایک شخص یا اشخاص ایک معینہ طریقہ پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہیں۔)

اس تعریف کی رو سے تمام قوانین اقتدار اعلیٰ نافذ کرتا ہے اور نافذ کرانے میں جبر کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ جان آسٹن کے اس نظریے کا تین پہلوؤں سے جائزہ لیا جاتا ہے[40]:

(الف) علم قانون کی اساس (ب) علم قانون کا طریق (ج) اخلاقیات کا تعلق

پروفیسر سالمنڈ نے آسٹن کی تعریف سے تین نکات اُجاگر کیے ہیں:[41]

۱۔ قانون ایک فرض ہے۔ ۲۔ قانون ایک حکم کا نام ہے۔

۳۔ اہم سیاسی قوتیں جہاں مناسب سمجھتی ہیں، ان قوانین کو جسمانی قوت کے ذریعے نافذ کرتی ہیں۔

بینتھم نے بھی ہابز اور آسٹن کے نظریہ قانون کی تائید کی۔ اور سالمنڈ نے بھی جزوی طور پر آسٹن کے نظریے کی تائید کی۔ اور اس نے تاریخی نظریہ قانون اور حکمیہ نظریہ قانون کے مابین توازن پیدا کرنے کی کوشش کی اور یہ کہا کہ قدیم زمانے میں قانون کی شکل رسم ورواج، مذہبی اصولوں اور رائے عامہ سے ملی جلتی تھی۔ لیکن قانون کے ضابطوں کے نفاذ میں جبر کا عنصر ضرور شامل ہوتا ہے۔

---

(38) Paton, Ibid, P.5

(39) Salmond, (Glanville), Ibid, P.29

(40) پیٹن، جارج وائٹ کراس، ڈاکٹر، قانون کے جدید مکاتب فکر، (کراچی: چراغ راہ قانون نمبر، جون ۱۹۵۸ء)، ص: ۱/ ۵۴

(41) Salmond, (Glanville), Ibid, P.29

۳۔ جان آسٹن کے نظریے پر اعتراضات :

اگر چہ قانونی مفکرین مثلاً سالمنڈ(Salmond) نے آسٹن(Austin) کے نظریہء جبر کی تائید کی ہے مگر اس کے باوجود اس کے نظریہ قانون پر اعتراضات اور تنقید بھی کی گئی۔ اور تنقید کرتے ہوئے درج ذیل اعتراضات کیے گئے:

(i) حکمیہ نظریہ قانون سے جس حقیقی امر کا اظہار ہوتا ہے وہ یہی ہے یعنی سلطنت کا اپنے احکام کی بجز تعمیل کرانا۔ اور اگر فی الواقع ایسا ہے تو اس کے خلاف جو تاریخی دلیل پیش کی جاتی ہے، اُس کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ علمائے قانون آسٹن کی تعریف پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قانون کو سلطنت کا حکم تعبدی (حکمیہ) کہہ دینے سے سننے والے کی طبیعت خوش ہو جاتی ہے لیکن یہ تعریف قدیم زمانے کے قانون پر صادق نہیں آتی۔ بظاہر قانون کی یہ تعریف مکمل اور صحیح معلوم ہوتی ہے مگر قدیم طرز کی ریاستوں کے لحاظ سے یہ غلط ثابت ہوتی ہے کیونکہ قدیم زمانہ کا قانون، سلطنت کا حکم تعبدی نہیں ہے بلکہ وہ رسم ورواج، مذہب اور رائے عامہ سے مستخرج اور ماخوذ ہے اور ریاست میں سب سے زیادہ مقتدر شخص یا جماعت نے اُس کو جاری نہیں کیا ہے۔ جب انسانی نظم معاشرت کو معقول ترقی ہوئی تو قانون نے موجودہ شکل اختیار کی اور لوگ اُس کو اقتدار اعلیٰ کا نتیجہ ماننے لگے لہٰذا اقتدار سیاسی اور تعمیل جبری سے پہلے قانون کی ایجاد ہوئی اور اس کو ان دونوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سلطنت اس لیے اُس کی تعمیل کرتی ہے کہ وہ سلطنت کے قیام کے پہلے سے موجود ہے، نہ کہ سلطنت قائم ہونے سے وہ قانون کی تعمیل کراتی ہے۔[42]

(ii) سالمنڈ، آسٹن کے حکمیہ نظریے کی تعریف پر دو اعتراضات پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

"The theory is one sided , Austin recognized only the formal sources of law but did not take into account its ethical and material sources, The theory implies that law is law because it is enforced by the physical force of the state and not because it is right or just." [43]

---

(42) مزید دیکھیے : (i) Bryce, Studies in History and Jurisprudence, Vol. 11 P. 42-44

(ii) Maine's Early History of Institutions, Lect, 12, P.346 and Lect. 13, P.380, (iii) Walker, Science of International Law, P.11-21

(43) Salmond, Ibid, P.29

(نظریہ یک طرفہ ہے، آسٹن نے صرف قانون کے عملی پہلوؤں کو اہمیت دی ہے اور اس کے اخلاقی اور مادی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ نظریے سے پتہ چلتا ہے کہ (یہ) قانون وہ قانون ہے کیونکہ یہ ریاست کے ذریعے جسمانی اور طاقت کے ذریعے عمل میں لایا جاتا جب کہ انصاف کے ذریعے نہیں۔)

گویا کہ آسٹن کا نظریہ قانون خیر اور اخلاقی قدروں سے یکسر خالی ہے۔ سالمنڈ کا سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کیونکہ اس کے نزدیک قانون خیر اور اخلاقی اصولوں ہی سے مرکب ہوتا ہے۔ اور قانون کا مقصد انصاف کا حصول ہے اور انصاف خیر کے تصور کے بغیر ناممکن ہے۔ اس بات کو سالمنڈ یوں بیان کرتا ہے:

"Much of justice in the abstract and ethical sense as recognized by law is enforced by the state enforces it because it is law."(44)

(ریاست میں قانون کے بہت سے تجریدی اور اخلاقی پہلو جنہیں قانونی تسلیم کیا جاتا ہے، محض اس لیے لاگو ہوتے ہیں کیونکہ انہیں قانون کا درجہ دیا جا چکا ہوتا ہے۔)

واضح ہوتا ہے کہ قانون محض زور اور جبر نہیں ہے، نہ محض ذریعہ انصاف ہے بلکہ ان دونوں کا حسین امتزاج ہے اور قانون کا بنیادی اور مرکزی نکتہ یہ ہونا چاہیے کہ قانون محض مجرد تحریری قانون نہیں بلکہ حصول انصاف کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ بالفاظ دیگر:

"The Judicial theory is not Lex (statute), but jus (Justice)." (45)

(iii) سالمنڈ کے مطابق آسٹن کی یہ تعریف نامکمل ہے۔ کیونکہ تمام قوانین حکمیہ نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ان کو جبراً نافذ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے مطابق:

"The theory is incomplete. All laws are not always imperative or commands. Many rules do not raise any obligations but merely give rise to liberties and powers."(46)

---

(44) Ibid, P.30

(45) Ibid

(46) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: Salmond, Ibid, P.30

(اگرچہ یہ نظریہ نامکمل ہے، تمام قوانین ہمیشہ حکمی نہیں ہوتے، بہت سے اصول بجائے فرائض کی آگاہی کے آزادی اور قوت کا شعور دیتے ہیں۔)

آسٹن کے نظریے پر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ جبری طور پر قانون کا نفاذ نہیں کرایا جاسکتا، یعنی قانون معاہدہ، قانون شہادت، وصیت، وراثت اور دوسری شہری قوانین کی بابت فوجداری کاروائی کی طرح عمل درآمد نہیں کیا جاسکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ آسٹن نے سول لاء اور فوجداری قانون کے درمیان حدّ امتیاز قائم نہیں کی بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ تمام قوانین کو جبراً نافذ کیا جاتا ہے۔

(iv) آسٹن کے نظریے پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر اس کے نفاذ میں جبر اور تادیبی کاروائی عمل میں نہیں لائی جاسکتی۔ قانون بین الاقوام کا احترام بھی معاہدات میں شامل ہوتا ہے، لہٰذا ریاست اور افراد معاہدات کا احترام کرتے ہیں اور معاہدہ شکنی کا سدّباب مؤثر طریقہ پر نہیں کیا جاسکتا۔

اسلامی تصور:

اسلامی شریعت نے حکومت کو مقررہ حدود میں رہنے کا پابند یا انکی غیر مسکون حیثیت کو ختم کر کے غلطیوں سے تجاوز کے بارے میں جواب دہ قرار دیتے ہوئے تین بنیادی اصول بیان کیے ہیں:

۱۔ حاکم کے حدواختیارات ۲۔ حاکم کی مسؤلیت ۳۔ امت کا حاکم کو معزول کرے کا حق

پہلا اصول، حاکم کے حدود اختیارات۔ شریعت کے نزول سے قبل حاکم کے اختیارات غیر محدود اور اس کا اقتدار قیود سے بالاتر وبرتر تھا۔ حاکم و محکوم کے تعلقات کا سارادارومدار محض زور و قوت پر تھا۔ قوت ہی حاکم کے اقتدار تھی۔ اور اسی پہ اس کے اقتدار کی حدود کا انحصار تھا۔ قوی وزور آور ہر چیز پر اپنا اقتدار جتا سکتا تھا۔ اور جہاں کسی کے قوت میں کمی آگئی تو اسی تناسب سے اس کے اقتدار میں بھی کمی آجاتی تھی۔ لوگ حاکم کی اطاعت اس لئے نہیں کرتے تھے کہ وہ ان پر حکومت کرتا اور ان کے امور سلطنت اسنبھالتا ہے۔ بلکہ محض اس لئے اس کے آگے ان کی گردنیں جھکتی تھیں کہ وہ زیادہ زور آور اور قوی ہوتا تھا۔ چنانچہ جب تک وہ اپنی لاٹھی کے زور سے انہیں ہانکے لئے جاتا تھا یا مال وجاہ کی قوت پر انہیں اپنا غلام بنائے رکھتا تھا، وہ اس کے فرمانبردار اور اطاعت شعار بنے رہتے تھے۔ پھر اگر اس کے زور و قوت میں کمی آجاتی تو کوئی دوسرا اٹھتا اور اسے زیر کر کے خود

(i) Dias , Ibid, Chap.14, (ii) L. Loyd, The idea of law, Chaps. 5,8, (iii) Friedmanne, Ibid, Chaps 19-20 (iv) Austin, Lecture I-II

بھی اسی طرح محض زور و قوت کے بل پر اپنا حکم چلاتا۔رعایا کی حیثیت حکمران و صاحب اقتدار کے غلاموں اور خادموں کی وہتی۔خواہ اس نے یہ اقتدار وراثتاً پایا ہو یا زور بازو سے حاصل کیا ہو۔

تقابلی جائزہ :

اس نظریہ کا جائزہ لینے سے معلوم ہو تا ہے کہ اس کی بنیادیں خوف، سزا اور ڈر پر تعمیر کی گئی ہیں، جس میں اقتدار اعلیٰ اپنی مرضی کے مطابق قوانین کا نفاذ کراتا ہے اور خوف اور جبر کی وجہ سے لوگ قانون کی اطاعت کرتے ہیں۔ جو کہ بذریعہ طاقت کرائی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود حکمیہ قوانین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھیں عوام الناس پر نافذ کیا جاتا ہے۔ کسی مخصوص طبقہ کے لئے نہیں بنائے جاتے۔ حکمیہ قوانین خدائی بھی ہو سکتے ہیں اور انسان کے بنائے ہوئے بھی ہو سکتے ہیں۔ اخلاقی قوانین کی نوعیت بھی حکمیہ ہوتی ہے۔ بین الاقوامی قوانین بھی حکمیہ ہوتے ہیں کیونکہ جو قوم اقوام متحدہ کی قرار دادوں پر عمل نہ کرے وہ دوسری اقوام کی نظر سے گر جاتی ہے۔

3۔ تاریخی نظریہ(Historical Theory of Law)

الف۔ مغربی تصور

تاریخ ہمیں وہ مواد فراہم کرتی ہے کہ جس کی بنیاد پر ہم کسی بھی علم کے ماضی کے احوال معلوم کر سکتے ہیں۔ تاریخ اور اُصول قانون کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ اور اصول قانون کی موجودہ حیثیت کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے اس کے ماضی کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

سرجان سالمنڈ کے مطابق:

"Historical jurisprudence is the general or philosophical post of legal history." (47)

(تاریخی اصول قانون، قانونِ تاریخ کا عام اور فلسفیانہ مرتبہ ہے۔)

اصول قانون اور تاریخ کا ناطہ بہت پرانا ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظریہ کہا جاسکتا ہے کہ:

---

(47) مزید دیکھیے: Fitzgerald, Ibid, P.109-112

"Jurisprudence and history are essential having stern and sever relation with each other".(48)

(اصولِ قانون اور تاریخ کا آپس میں مضبوط اور شدید تعلق ہے۔)

قانون کا تاریخی نظریہ نہ تو مقتدر اعلیٰ کے حکم کا نام ہے اور نہ ہی نظریاتی اصولوں کا مجموعہ ہے بلکہ قانون کے تاریخی مکتبہء فکر کے نزدیک انسان کی ضروریات اور احتیاجات کے لیے معرض وجود میں آیا۔ وقت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسانی ضرورتوں میں اضافہ ہوا اور اس طرح اُصولِ قوانین وجود میں آ گئے۔ جیسا کہ عدالتی نظائر (Precedents) "نظائر" اس قانون کو کہتے ہیں جو عدالتیں فیصلہ جات کی شکل میں وضع کرتی ہیں۔ ان قوانین کو جج کے بنائے ہوئے قوانین (Judge-made law) بھی کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ سالمنڈ کہتا ہے:

"نظیر سے مراد عدالت کا ایسا فیصلہ ہے جو کسی قسم کے حقائق رکھنے والے معاملہ میں ایک حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ یعنی اس قسم کے حقائق عدالت کے سامنے آئیں جو کہ نظیر پر مذکور ہوں تو عدالت نظیر پر عمل کرنے کی پابند ہوتی ہے۔" (49)

نظائر کی قانونی حیثیت :

عدالتی نظائر بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انگلستان میں نظائر کا استعمال تیرہویں صدی عیسوی میں ایڈورڈ اوّل کے زمانے میں شروع کیا گیا تھا۔ اس کی اہمیت کے بارے میں سر جان سالمنڈ تحریر کرتا ہے:

"The importance of judicial precedents has always been a distinguishing characteristic of English law."(50)

(عدالتی نظائر کی اہمیت ہمیشہ سے انگریزی قانون کی ممتاز خاصیت رہی ہے۔)

---

(48) Paton, Ibid, P.19

(49) Salmond, Ibid, P.87

(50) Fitzgerald, Ibid , P-141

مغربی یورپ کے ایک اہم علاقے انگلستان پر رومیوں کی تاخت وتاراج کے نتیجہ میں کافی عرصہ تک رومی نظریات وتصورات کا غلبہ رہا۔ رومیوں کے خیالات پر دیوی دیوتاؤں اور خداؤں کے زیر اثر شخصیت پرستی کے اثرات نمایاں تھے۔ اس وجہ سے ججوں کے فیصلوں کو اس شخصیت پرستی کے جذبات کے تحت تقدس حاصل ہوگیا اور انہیں اہمیت دی جانے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان میں عدالتی نظائر کو اس قدر اہمیت حاصل ہوگئی کہ عام قانون تو ایک طرف، اُصولی قانون (آئین وغیرہ) بھی عدالتی نظائر کے تابع ہوگیا۔ انگلستان نے جب امریکہ اور جنوبی ایشیا (پاک وہند وغیرہ) پر قبضہ کیا تو یہاں بھی عدالتی نظائر کی اہمیت کے اثرات چھوڑے۔[51]

بعض اوقات انگلستان کے نظائری قانون کو غیر مکتوبہ قانون بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا بیشتر قانونی سرمایہ عدالتی نظائر کے مرہون منت ہے۔ اور اعلیٰ عدالتوں کے نظائر کی پابندی لازم تصور کی جاتی ہے۔ لیکن سالمنڈ کے مطابق:

"So the decisions of English courts are a legal and authoritative source of English law, but those of American courts are in England merely an historical and unauthoritative source".[52]

(انگریزی عدالتوں کے فیصلے قانون انگلستان کے مآخذ قانونی ہیں لیکن امریکہ کی عدالتوں کے نظائر اس قانون کا محض تاریخی اور غیر سندی مآخذ خیال کیے جاتے ہیں۔)

سالمنڈ اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے:

"A judicial precedent speaks in England with authority, it is not merely evidence of the law, but a source of it, and the courts are bound to follow the law that is so established".[53]

(عدالتی نظائر انگلستان میں سند کے ساتھ مستعمل ہیں۔ یہ صرف قانون کے گواہ ہی نہیں بلکہ قانون کے مآخذ بھی مانے جاتے ہیں۔ اور عدالتیں قانون کی پیروی کی پابند ہیں۔)

---

(51) عبدالمالک عرفانی، ڈاکٹر، مغربی قوانین کا تاریخی پس منظر، (ماہنامہ نوائے قانون، اسلام آباد، دسمبر ۱۹۳۹ء)، ص:۴۶

(52) Salmond, Ibid, P.134

(53) مزید دیکھیے: (i) Fitzgerald, Ibid, .141 , (ii) Glanville, Ibid, P.162

تاریخی مکتبہء فکر سے مراد یہ ہے کہ اُصول قانون کا مطالعہ اس کے پس پشت تاریخی محرکات سے ہی ہو سکتا ہے کیونکہ قانون خلا میں وضع نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی مکتبہ فکر کے مفکرین کے نزدیک اصول قانون بذات خود قانون کے ارتقاء کی ماضی کی کہانی ہے۔ اس طریقے سے ہمیں ایک قانون کی صحیح بنیاد سے آگاہی و علم حاصل ہوتا ہے اور یہ بھی کہ یہ اُصول قانون کن معاشرتی، سماجی یا سیاسی تقاضوں کے تحت وضع کیا گیا۔ اس مکتبہ فکر کے بانی کا نام سیوگنی (Savigry) (۱۸۲۱ء۔۱۷۷۹ء) ہے جو ایک جرمن محقق تھا۔ جارج وائٹ کراس پیٹن اس مکتبہ فکر کے آغاز کے بارے میں لکھتا ہے:

"The historical school in past was a result of that surge of nationalism that arose at the end of the eighteenth century. Instead of the individual, writers began to emphasize the spirit of the people, the volkgeist." (54)

(تاریخی مکتبہء فکر ایک حد تک قوم پرستی کی اُس لہر کا نتیجہ تھا، جو اٹھارویں صدی کے اخیر میں اٹھی تھی۔ مصنفین فرد کے بجائے عوامی جذبے پر زور دینے لگے تھے۔)

۱۸۴۱ء میں اس مکتبہء فکر کے بانی سیوگنی نے ایک واضح پروگرام بنایا۔ مرکزی اور بنیادی سوال یہ تھا کہ "How did law come to be?" یعنی قانون کیسے وجود میں آیا؟ اس کا جواب کرزن کے ان الفاظ سے ملتا ہے:

"The historical school of jurisprudence is built on the belief that the study of existing law requires an understanding of its historical roots and growth." (55)

(اُصول قانون کا تاریخی مکتبہ فکر اس عقیدے یعنی اصول پر قائم ہے کہ پہلے سے موجود قانون کا مطالعہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کے تاریخی وجود پر اس کو سمجھا جائے۔)

سیوگنی نے تاریخی نظریہ قانون کی تعلیم دیتے ہوئے کہا:

---

(54) Ibid.

(55) Curzon, Ibid, P.153

"There was an organic connection between law and a people's nature and character as developed through history."(56)

(قانون اور لوگوں کی فطرت اور کردار میں ایک نامیاتی مطابقت ہے جو تاریخ کے ذریعے پروان چڑھی۔)

سیوگنی کے نظریے کو کرزن نے مختصر الفاظ میں اس طرح واضح کیا ہے:

"All law is originally formed by custom and popular feeling, that is by silently operating forces."(57)

(تمام قوانین حقیقت میں عام اور پسندیدہ رواج اور محسوسات اور خاموش قوتوں کے عمل کا نتیجہ ہیں۔)

سیوگنی کے نظریہ کی ان کے ایک شاگرد عزیز Puchta (۱۲۴۶۔۱۷۹۸)نے بھرپور طریقے سے آبیاری کی۔ سیوگنی کے اس نظریہ کا اثر انگلستان کے ماہرین قانون پر بھی پڑا۔ مثلاً سر ہنری مین (۱۸۸۸۔۱۸۲۲) (Sir Henry Maine)، برائس(۲۲۰۱۔۱۸۳۸)(Bryce)، اور سپنسر(۱۸۹۳۔۱۸۲۰)(Spencer) نے اس کے نظریے کے زیر اثر اپنا نظریہ قانون بھی پیش کیا۔ سر ہنری مین نے موجودہ قانونی نظام کو سمجھنے کے لیے تاریخی محرکات کے مطالعہ کو ضروری قرار دیا ہے۔(58) جبکہ سالمنڈ(Salmond) نے اس مکتبۂ فکر کی تائید اس طرح کی ہے:

"Historical jurisprudence is the history of the first principles and conceptions of the legal system."(59)

(تاریخی اصولِ قانون دراصل قانونی نظام کے پہلے اُصول کی تاریخ ہے۔)

سالمنڈ تاریخی نظریۂ قانون کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"It deals in the first place with the general principles governing the origin and development of law, and with the influences that affect the

---

(56) Ibid, P.155

(57) Ibid.

(58) See, Curzon, Ibid, P.162-167

(59) Salmond, (Glanville), Ibid, P.6

law. It deals in the second place with the origin and development of those legal conceptions and principles which are so essential in their nature as to deserve a place in the philosophy of law." (60)

(سب سے پہلے تو یہ اُن عمومی قوانین سے متعلق ہے جو قانون کے نقطۂ آغاز اور ترقی کو قابو میں رکھتے ہیں اور ان اثرات سے بھی متعلق، جو قانون کو متاثر کرتے ہیں۔ ثانیاً ان قانونی تصوّرات اور اصولوں سے متعلق ہے، جو نہایت اہم ہیں اور اس وجہ سے قانونی فلسفہ میں ان کا الگ مقام ہے۔)

اعتراضات :

سالمنڈ تاریخی نقطہ نظر سے قانون کی اہمیت ماننے کے باوجود اس پر اعتراض بھی کرتا ہے۔ اس کے مطابق ماضی کے رسم ورواج کے ذریعہ جنم لینے والے قانون کو آج کے معیار کے مطابق قانون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن اس نظریہ کے حامیوں کا خیال ہے کہ قانون کی نوعیت اور قانونی تبدیلیوں کو تاریخ کے مطالعے سے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ قانون اپنا مواد ہمیشہ تاریخی ورثے سے حاصل کرتا ہے۔

اس مکتبہء فکر کے حامیوں کے مطابق :

"قانون کا منبع حاکم کا حکم ہے، نہ عوام کے رسم ورواج، بلکہ اس کا سرچشمہ اچھائی اور نیکی کا وہ جبلی احساس ہے جو ہر نسل میں موجود ہوتا ہے۔ رسم ورواج قانون کے شاہد ہوسکتے ہیں لیکن اصل منبع لوگوں کے اذہان اور لاشعور میں ہوتا ہے۔" (61)

پیٹن بھی اس نظریے پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے:

"It naturally led to a distrust of any deliberate attempt to reform the law. Legislation can succeed only if it is on harmony with the internal

Salmond, (Glanville), Ibid, P.6 (60)

Paton, Ibid.P.19 (61)

conviction of the race to which it is addressed. If it goes farther, it is doomed to failure."[62]

(یہ مکتبہ قدر تاً قانون کی اصلاح وترمیم کے خلاف ہے قانون سازی اُسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے، جب یہ نسل کے داخلی اور قلبی احساسات جرم سے مطابقت رکھتی ہو۔ اگر یہ اس حد سے زیادہ آگے نکل جاتی ہے تو اس کی ناکامی یقینی ہے)۔

اس مکتبہ کے حامی قانون میں تبدیلی کے قائل نہیں ہیں، بلکہ ان کا کہنا ہے کہ قانون دراصل صدیوں پرانے تجربات کا نچوڑ ہے۔ اور جب تک ان سے استفادہ نہ کیا جائے یا ان کی افادیت ختم نہ ہو جائے۔ ان کو منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی اس کی اہمیت سے انکار ممکن ہے۔

ب۔ اسلامی تصور:

اسلامی قانون اپنے روز اول سے انسانی فطرت اور خدا کی دی ہوئی ہدایت پر مبنی ہے۔ اس میں خاندانوں ار قبیلوں کے رجحانات وتعصبات کو کوئی دخل نہیں ہے۔ رسول ورواج اس میں اگر کوئی دخل رکھتے ہیں تو صرف ایک محدود گوشہ کے اندر رکھتے ہیں اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ وہ خدا اور رسول کی کسی ہدایت کے خلاف نہ ہوں۔ اس کے ماضی اور حاضر میں گہرا ربط ہے اور مستقبل میں اس کی ترقی کے خطوط بھی بالکل معین ہیں۔ انسانی قانون عدل، مساوات اور رحم وانسانیت کی جس منزل تک اب پہنچنے کی آرزو کر رہا ہے اسلامی قانون کا پہلا قدم وہیں سے اٹھا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہے کہ اگر انسانی قانون اپنی اس معراج آرزو کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو جس دن اس کو یہ کامیابی حاصل ہو گی اس دن وہ اسلامی قانون میں تبدیل ہو جائے گا۔ قرآن مجید اسلامی قانون کے ارتقاء کی تاریخ اس طرح بیان کرتا ہے کہ انسان نے جب سے دنیا میں قدم رکھا ہے اسی وقت سے اس قانون کا آغاز ہوا ہے دنیا میں سب سے پہلے انسان حضرت آدمؑ تھے۔ وہ تمام نسل انسانی کے باپ بھی تھے اور خدا کے پہلے پیغمبر بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو قانون اسلامی کی وہ تمام باتیں بتائیں جو اس دور کے لیے ضروری تھیں اور حضرت آدمؑ نے یہ ساری باتیں اپنی اولاد کو بھی سکھائیں۔ قرآن مجید نے اس قانون کی حکمت اور ضرورت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ انسان صحیح زندگی بسر کرنے اور دنیا و آخرت کی فلاح حاصل کرنے کے لیے ان قوانین کا محتاج تھا۔ ان کے بغیر اس کی قوتوں اور قابلیتوں کی تربیت اور اس کی زندگی کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اگرچہ حضرت آدمؑ کے دور کے علوم

(62) Ibid, P. 19

اور احکام کی تفصیلات قرآن میں نہیں بیان ہوئی ہیں، کیونکہ قرآن مجید خدا کی آخری کتاب ہے اور یہ اسلامی علوم و قوانین کو ان کی کامل اور آخری شکل میں پیش کرتی ہے، لیکن پھر بھی قرآن نے جگہ جگہ بعض ان باتوں کا حوالہ دیا ہے جو حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت کو سکھائی گئی تھیں۔

عقائد اور علوم سے متعلق قرآن اس عہد کی جن باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے ان میں سے متعلق چند باتیں سورۃ البقرہ کی آیات ۳۰ تا ۳۸ میں اس طرح پیش ہیں: ایک یہ کہ انسان کو خدا نے اس دنیا میں خود مختار اور مطلق العنان بنا کر نہیں چھوڑا ہے، بلکہ اس کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا ہے۔ اس کو جو اختیار ملا ہوا ہے وہ اس کا ذاتی نہییں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا تفویض کردہ ہے، اس وجہ سے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے اختیارات اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود قوانین کے اندر ہی استعمال کرے، ورنہ وہ خونریزی اور فساد میں مبتلا ہو جائے گا۔

دوسری یہ کہ نوعِ انسانی کو اپنے قوانین اور احکام سے آگاہ کرتے رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ برابر اپنے نبی اور رسول بھیجتا رہے گا تاکہ منصب خلافت کی ذمہ داریاں بااحسن وخوبی ادا کرتے رہنے کے لیے اس کو رہنمائی حاصل ہوتی رہے۔

تیسری یہ کہ آدمؑ اور ان کی ذریت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ابلیس اور اس کی ذریت سے ہے۔ اگر کبھی شیطان کی اکساہٹ سے خدا کی کوئی نافرمانی صادر ہو جائے تو فوراً توبہ اور اصلاح کرے۔

چوتھی یہ کہ دنیا بنی نوع انسان کے لیے ایک امتحان گاہ ہے۔ یہاں انسان سے اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی اور اپنے قانون کی فرمانبرداری کا مطالبہ کیا ہے۔

پانچویں یہ کہ اس دارالامتحان میں اپنے آپ کو شیطان کے حملوں سے محفوظ رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آدمی ہر قسم کی مشکلات کے باوجود قانون اور شریعت کی پابندی کرے۔

ج۔ تقابلی جائزہ:

بعض مستشرقین کہتے ہیں کہ اسلامی قانون، قانون روما سے ماخوذ ہے۔ لیکن یہ ان کی خام خیالی ہے، کولینیٹ (Collinet) نے کہا ہے کہ جسٹی نین نے ۱۶ جولائی ۵۵۱ء کو بیروت کا آخری رومن اسکول بھی بند کر دیا تھا۔ اور اس کے سو سال بعد ۶۳۵ء میں عربوں نے شام و عراق فتح کیا، اس صورت میں اس کی تاریخی حقیقت کیا رہ جاتی ہے، جب رومن قانون

عالم عربی میں کبھی نافذ ہی نہیں ہوا اور نہ عربوں کا اس سے براہ راست سابقہ پڑا تو پھر اس سے تاثر کیسے فرض کیا جاسکتا ہے؟[63]
آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر گب (H.R.A.Gibb) شریعت کے آزادانہ ارتقاء کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ عام اصول، جن پر فقہ اسلامی کی بنیاد ہے۔ فقہاء روم کے اصول و قواعد سے بالکل الگ ہے"۔[64] اور "پہلی دو صدیوں میں فقہاء کی کوششوں سے وہ شاندار عمارت تیار ہوئی، جس کا تاریخ میں کوئی مقابل نہیں"۔[65]

ولسن کی تحقیق کے مطابق:

"عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور آغاز اسلام کے وقت مشرق میں قانون روما شروع سے رائج ہی نہ تھا اور مشرقی روایات اور پادریانہ تحکیمات کا دور دورہ تھا، قانون روما کا احیاء صدیوں بعد نشاۃ ثانیہ میں شروع ہوا"۔[66]

مغربی مفکرین اپنے عام دستور اور خواہش کے مطابق ہر چیز کا آغاز قدیم یونان سے اور ہر بُری یا کمزور بات کا آغاز کسی نہ کسی مشرقی ملک کے تذکرہ سے کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں علم و حکمت کا ہر موتی یونان ہی کے صدف کا مرہون منّت ہے چنانچہ علم اصول قانون یا جورس پروڈنس کے آغاز پر گفتگو کرتے ہوئے بھی ان کی نگاہ مکالمات افلاطون اور تصنیفات ارسطو پر ہی پڑتی ہیں۔ افلاطون کی "جمہوریہ" میں سقراط کی زبان سے قانونی اہمیت کے اعتراف اور پابندی کے لزوم وغیرہ کے بارے میں جو گفتگوئیں اور اشارے دیئے گئے ہیں۔ انکا حوالہ لے کر علم اصول قانون کا آغاز یونان سے ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس دور کی تحریروں میں (ان کی تاریخی حیثیت سے قطع نظر) علم الاصنام، اساطیر، اخلاقی ہدایات، مظاہر فطرت پر استعجاب اور مذہبی خیالات اس طرح ملے جلے ہیں کہ ان کی بنیاد پر قانون کا کوئی واضح تصور نہ خود یونانیوں نے پیش کیا اور نہ آج ان تحریروں کی مدد سے دریافت کیا جاسکتا ہے۔ قدیم یونانیوں کی تحریروں میں عدل و انصاف کی دیویاں اور طاقت و حکومت کے دیوتا تو بولتے نظر آتے ہیں۔ وہاں یونانیوں کے مشرکانہ اساطیر کے قصوں میں دیوتا تو چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان کے مکالمات سے اصول قانون یا جورس پروڈنس کے تصورات برآمد کرنے کا دعویٰ کرنا نہ صرف تاریخی

---

(63) مولانا شمس تبریز خان، مسلم پرسنل لاء اور اسلام کا عائلی نظام، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ ۱۹۸۳ء، ص:۱۰۹

(64) ایضاً

(65) ایضاً

(66) Willson, Anglo-Muhammadan law, P.6

طور پر بے بنیاد بات ہے، بلکہ ایک مضحکہ خیز جسارت بھی ہے۔[67] اسی طرح سے امریکہ اور برطانیہ دونوں کے آئین ایک دوسرے سے مختلف ہیں جیسا کہ امریکہ کا آئین تحریری اور غیر لچکدار ہے جبکہ برطانیہ کا آئین غیر تحریری اور لچکدار ہے۔ علاوہ ازیں ان کے ہاں قانون سازی کا طریقہ کار بھی مختلف ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنے ایک مقالہ " تاریخ قانون میں مسلمانوں کا حصہ " میں تحریر کرتے ہیں کہ آج کل کہا اور پڑھایا جاتا ہے کہ قانون کی تعمیل اس لیے کرنا چاہیے کہ وہ ملک کے مقتدر اعلیٰ (بادشاہ یا پارلیمنٹ) کا حکم ہے۔ اور اگر اس کی تعمیل نہ کریں تو وہ ہمیں پولیس، فوج اور عدالت کی مدد سے مجبور کرے گا۔ کہ اس کے حکم کے مطابق عمل کیا جائے، لیکن بیان میں کئی خامیاں ہیں۔ پہلے یہ کہ قانون کا بعض لوگوں پر اطلاق نہیں ہو سکتا مثلاً قانون انگلستان یہ کہتا آیا ہے: "وہ اور دیگر مغربی قوانین بھی، غیر ملکی سفیروں وغیرہ کو مقامی عدالت کے اختیار سماعت سے باہر مانتے ہیں۔ دوسری خامی یہ ہے کہ اس کے خلاف ضد جبر ہے" اور وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے فرائض کو چھپائے اور قانون کی زد میں نہ آئے۔[68]

اس کے برعکس دیکھا جائے تو اسلامی قانون کی تعمیل کی اساس قانونِ خداوندی ہے۔ جس کے تحت اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ اور روزِ جزا ہمیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا۔ اور اسی طرح سے تاریخ دستور کے پہلو سے دیکھا جائے تو تحریری دستور حکومت صرف اسلام کا ہے۔ اگرچہ ارسطو کے دستور " ایتھینز" کو دستورِ مملکت کہا جاسکتا ہے لیکن یہ وزیروں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ کسی حکمران کی طرف سے نافذ کردہ آئین نہیں ہے۔ مزید برآں ارسطو کی کتاب میں شہری مملکت "ایتھنز" کے دستور کی تاریخ اور ارتقاء بھی بتایا گیا ہے۔ گویا یہ ایک درسی اور تاریخی کتاب ہے، قانونی دستاویز نہیں ہے۔ ارسطو سے پہلے سولن[69] کا کارنامہ بھی اس ذیل میں نہیں آتا۔ کیونکہ نہ صرف یہ کہ سولن ملک کا واحد حکمران نہیں تھا۔ بلکہ یہ بھی کہ اس نے اپنے وطن کے دستور میں صرف چند ترمیمیں کیں، سارا دستور مدون اور نافذ نہیں کیا۔

(67) غازی، م۔ن، ۲، ص:۲۶

(68) (i) حمید اللہ، ڈاکٹر، تاریخ قانون میں مسلمانوں کا حصہ، (نذر عابد، مرتبہ، مالک رام)، (نئی دہلی: مجلس نذر عابد، ۱۹۷۴ء)

(ii) حمید اللہ، محمد، ڈاکٹر، نگارشات ڈاکٹر محمد حمید اللہ، (لاہور: بیکن بکس، ۲۰۰۴ء)، ص:۴۸۷۔۴۸۸

(69) سولن: یہ مشہور یونانی مقنن تھا اس نے (۵۶۴ء) میں یونانی منظوم قصیدوں کی باقاعدہ ترتیب کی، شبلیؒ نعمانی، قانون یالائی، (ماہنامہ، الندوۃ، اگست ۱۹۰۹ء۔ نمبر ۷)، ص: ۱۳/۶

یونانی تاریخ کے لیے مزید دیکھیے: ڈی، اولیری، فلسفہ اسلام، مترجم، احسان احمد، (کراچی: نفیس اکیڈمی، س۔ن)، ص:۱۳۔۵۳، ص:۶۷۔۷۳

زمانہ حال میں انگریزوں کا میگنا کارٹا جن حالات میں بھی مرتب ہوا ہو، وہ بہر حال ۱۲۱۵ء میں وجود میں آیا۔ فرانسیسی اور امریکی دستور تو اور بھی بعد کے ہیں۔ ان حالات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور مملکت مدینہ جو ۶۲۲ء کے غالباً ماہ جون میں مدون اور نافذ ہوا، دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور مملکت کہا جا سکتا ہے۔(70)

4۔ عمرانی نظریہ (Sociological Theory of Law):

علم عمرانیات میں معاشرے کی فلاح و بہبود سے متعلقہ تمام اُمور کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ عمرانیات کو

"The study of man in society." (71)

عمرانیات، (معاشرے میں انسان کے مطالعہ کا نام ہے۔) سے واضح کیا جاتا ہے۔

الف۔ مغربی تصور:

لفظ "Sociology" کی اصطلاح سب سے پہلے ایک فرانسیسی فلسفی آگسٹ کومٹ (۱۷۹۸ء - ۱۸۵۱ء) نے استعمال کی تھی۔ اس کیلیے بینتھم (۱۷۴۸ـ۱۸۳۲) نے سوشل سائنس کی اصطلاح استعمال کی اور اس کو فطرت انسانی سے ہم آہنگ کیا لیکن اس نے تاریخی پہلو کو نظر انداز کر دیا اور پھر بعد میں اپنی سائنٹیفک تحقیق پر ثابت قدم بھی نہ رہا اور فطری قوانین کی جانب مائل ہو گیا۔ ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) (۱۸۲۰ءـ۱۹۰۳ء) نے اس مکتبہ ءفکر کو تقویت دی۔ بعد ازاں جھیرنگ (Jhering) (۱۸۱۸ـ۱۹۲۹) اور ویبر (Weber) (۱۸۶۴ـ۱۹۲۰) نے اس مکتبہ ءفکر کیلیے بہت سا تحقیقی کام سرانجام دیا اور اس کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اس مکتبہ ءفکر کا اثر امریکہ میں بھی ہوا اور روسکو پاؤنڈ (Roscoe Pound) (۱۸۷۰ـ۱۹۶۴ء) (نے اس مکتبہ ءفکر کی امریکہ میں ترویج کی۔ ڈین پاؤنڈ (Dean Pound) کا نام اس مکتبہ ءفکر میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں پیٹن (Paton) نے بھی اس مکتبہ ءفکر میں نمایاں مقام پیدا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں اس مکتبہ ءفکر کا نام "اُصول قانون کا عملی اسکول "Functional School" "بیان کیا ہے۔

کرزن (Curzon) کے مطابق:

---

(70) ایضاً، ص: ۴۹۰

(71) Salmand, (Glanville), ibid. P.14

"Modern Sociology is in its widest sense, the study of society based on the observation, description and analysis of social phenomena."(72)

(جدید عمرانیات اپنے وسیع تر معنی میں معاشرے کے مشاہدے، تذکرے، تجزیے اور سماجی مظہر کی بنیاد پر مطالعہ کا نام ہے۔)

عمرانی اصولِ قانون کی اساس چونکہ معاشرے کے اُصولوں پر ہوتی ہے۔ اس لیے ایک ماہر عمرانیات (Sociologist) یہ بھی دیکھتا ہے کہ قانون کا معاشرے پر کیا اثر ہے اور کس حد تک قانون پر عمل ہو رہا ہے اور کس حد تک قانون کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اور قانون کو نظر انداز کرنے کے اسباب کیا ہیں۔ اسی طرح عمرانیات میں جرائم کے اسباب، مجرموں کے طرزِ عمل اور سزاؤں کے اثرات کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے۔

اس مکتبہ فکر کا بنیادی اصول یہ بتایا جاتا ہے:

"The fundamental tenet of this school is that we can not understand what a thing is unless we study what it does."(73)

(اس مکتبہ فکر کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہم کسی چیز کی حقیقت اس وقت تک معلوم نہیں کر سکتے جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ وہ چیز کیا افعال یا کام سرانجام دیتی ہے۔)

عمرانی نظریے کے مطابق قانون کو سماجی حالات کا آئینہ دار تصور کیا جاتا ہے۔ اس نظریے کے حامیوں کا خیال ہے کہ قانون کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے مخصوص آئینی تصورات کو ہی ملحوظِ خاطر رکھنا کافی نہیں بلکہ ہر قانون کو اس کے نتائج کے اعتبار سے جانچا جاتا ہے۔ چنانچہ مطالعہ قانون کے سلسلے میں عمرانیات کے اُصولوں کا مطالعہ بھی شامل ہونا ضروری ہے۔ اور اس مطالعہ میں ان اقدار کو بھی زیر مطالعہ لانا چاہیے جن کے تحت قانون بنتا اور ترقی پاتا ہے۔ کولسن سائنسی طریق کو برقرار رکھنے کی خاطر ان اقدار سے انکاری ہے۔ لیکن ڈین پاؤنڈ کا خیال یہ ہے:

"They must be analysed throughly order to understand legal development."(74)

---

(72) Curzon, Ibid, P.138

(73) Paton, Ibid, P.22

(قانونی ارتقاء کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ان (اقدار) کا جائزہ اور مطالعہ بغور کرنا چاہیے۔)

سالمنڈ عمرانی نظریے کی قانونی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"Sociology has helped jurisprudence in its approach to many legal, especially penal reforms."[75]

(عمرانیات نے اصولِ قانون کی بہت سے قانونی اور خصوصاً فوجداری قانون کی اصلاحات میں مدد کی ہے۔)

اس نظریے کا جدید مبلغ مشہور عمرانی مقنن اینگن آلرش (Engen Ehlrich) ہے۔ وہ معاشرہ کی اجتماعی "قانون سازی" کو مملکت یا ریاست کی تخلیق اور قانون سے بالاتر تصور کرتا ہے۔[76]

مغربی مفکرین[77] نے رسم ورواج (Custom) کو بھی ان ہی معنوں میں بیان کیا ہے۔ اس مکتب فکر نے معاشرہ کے رسوم ورواج کو ہمیشہ بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور انہیں آئینی حیثیت میں قانون سے فائق سمجھا ہے، اب ظاہر ہے کہ ایسا سمجھنا، دراصل مآخذ قانون اور قانون کے معاملہ میں رسوم ورواج کی اصل حیثیت کو گڈمڈ کر دینے کے مترادف ہے۔ یہ لوگ اس سلسلہ میں جدید ریاست کی نوعیت کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جدید ریاست ایک زبردست بااختیار طاقت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور یہ اپنے معاشرہ کے طور طریق کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی ایک وسیع قدرت رکھتی ہے۔ چنانچہ آج کی زندگی کے حقائق قانون کے بارے میں اس نظریہ کے صریحاً خلاف ہوتے ہیں جو ریاست کو اپنے مآخذ اور مضمرات کی تشکیل کے لیے ایک ثانوی درجہ دیتا ہے۔[78]

ب۔ اسلامی تصور:

ابن سینا[79] کہتے ہیں:

---

(74) مزید دیکھیے: (i) Curzon, Ibid, P.137-152

(ii) International Encyclopedia of Social Sciences, Vol, 9. P.49-58

(75) Salmond, (Glanville), Ibid, P.6

(76) خورشید احمد، قانون اور فلسفہ قانون، (چراغ راہ، اسلامی قانون نمبر، حوالہ مذکور)، ص:۱/ ۴۰

(77) Curzon, Ibid, P.236-237

(78) ایضاً، ص:۱/ ۴۰

(79) ابن سینا، ابو علی الحسین بن عبد اللہ، (م ۱۰۷۳ھ): عرب فلسفی، طبیب، ریاضی دان، سائنس دان تھا، (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ص:۵۶۰۔۵۷۶)

”ان من المعلوم ان الانسان یفارق سائر الحیوانات بانه لایحسن معیشة لو انفرد وحدا یتولی تدبیر امره من غیر شریک یعاونه علی ضروریات حاجاته.... فاذا کان هٰذا ظاہراً فلابد فی وجود الانسان وبقائه من مشارکة، ولاتتم المشارکة الا بمعاملة کما لابد فی ذٰلک من سائر الاسباب التی تکون له ولا بد فی المعاملة من سنة وعدل“۔[80]

”یعنی انسان کا باقی تمام حیوانات سے اس بناء پر ممتاز و منفرد ہونا معلوم ہے کہ وہ تنہا اپنی ضروریات حیات کی تکمیل نہیں کر سکتا بلکہ اجتماعی زندگی گزارنا اس کی فطری مجبوری ہے اور زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے مشارکت وتعاون لازمی ہے۔ جس کا نتیجہ باہمی لین دین اور معاملات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور معاملات کا تقاضا ہے کہ ان کے لیے عدل وانصاف کے قوانین متعین ہوں۔“

لیکن ہر قوم کا قانونی نظام اس کے نظریہ حیات، تہذیبی تصورات اور ملی احساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، بقول ڈاکٹر مصطفی الزرقاء کے:

”الشرع بوجه عام فی امة من امة لیس الا صورة صحیحة لحیاة اجتماعیة واقعة........ولیس اختلاف الشرائع بین الامم الا تعبیر عن الاختلاف فی الحیاة الاجتماعیة والاقتصادیة فیما بینهاوفی الاہداف. التی تتجه نحوہا هٰذا الحیاة. وفی المثل العلیا التی تستلهمهاالامة وتستدعیهاعن عقیدتها“[81]

یعنی ”قانون کسی امت کی اجتماعی اور اقتصادی زندگی کی حقیقی تصویر ہوا کرتا ہے.......اور مختلف امتوں کے نظام ہائے قانون کا باہمی اختلاف ان کی معاشرتی واقتصادی زندگی، مقاصد واہداف اور آداب واقدار کے اختلاف پر مبنی ہوتا ہے۔“

---

(80) ابن سیناؒ، ابو علی الحسین بن عبداللہ، (م ۱۰۳۷ھ)، الشفائ، (الامیریہ القاہرۃ، ۱۹۵۲ء)، ص:۱ / ۴۴

(81) الزرقائ، مصطفی احمد، م۔ن، ص:۱ / ۲۷ مزید دیکھئے:

(i) التھانویؒ، محمد بن اعلیٰ، (م ۱۷۷۷ء) کشاف اصلاحات الفنون، (خیاط، بیروت، س۔ن) ص:۱/ ۳۰

(ii) محمد بن نظام، شرح مسلم الثبوت، ص:۱۱۔۱۲

(iii) ابن القیمؒ، شمس الدین، محمد بن ابی بکر، (م ۷۱۵ھ)، اعلام الموقعین عن ربّ العالمین، (دار الفکر، بیروت، لبنان، س۔ن)، ص:۱ / ۳۵

(iv) الشاطبیؒ، الموفقات، ص:۲ / ۴۴۲

اسلام دین فطرت ہے۔ وہ فکری، عملی، اخلاقی اور روحانی ہر پہلو سے مربوط ہے اور انفرادی و اجتماعی نصب العین کا آئینہ دار ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

(مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَن يَعْمُرُواْ مَسَاجِدَ اللہ شَاهِدِينَ عَلَى أَنفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ أُوْلَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ)[82]

"مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق و مددگار ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ ادا کرتے ہیں اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں۔"

کولسن اسلام کی ہمہ گیر اور جامع تعلیمات کو اس طرح سے بیان کرتا ہے:

"In theory of course, the shariah has always been a totalitanian and comprehensive code of conduct covering every aspect of human life and regulating the individual's relations with God, with the state, with his neighbor and with his own conscience on the same single basis of the dictates of the divine command".[83]

(نظری طور پر شریعت اسلامیہ ہمیشہ سے حیات انسانی کے تمام شعبوں پر محیط ایک مکمل اور جامع ضابطہ عمل ہے جو انسان کے اپنے خالق کے ساتھ تعلق، نیز ریاست، پڑوسیوں اور خود اپنے شعور کے ساتھ تعلقات کی تنظیم، الہامی ہدایت سے ماخوذ یکساں بنیادوں پر کرتی ہے۔)

زمانہ ءقدیم میں رسم ورواج کو قانون کا مآخذ نہیں بلکہ خود قانون سمجھا جاتا تھا، رفتارِ زمانہ کے ساتھ ان رسم ورواج کو اقتدارِاعلیٰ کی طرف سے قوت نافذ حاصل ہوتی گئی اور وہ باقاعدہ قانون کی حیثیت اختیار کرتے چلے گئے۔ جیسا کہ فٹز آلڈ لکھتا ہے:

"Custom is an important source of law in early time"[84]

---

(82) التوبۃ۹ : ۱۷

(83) Coulson, N.J, Conflicts & Tention in Islamic Jurisprudence Chicago,1949, P.8

(84) Fitzgerald, Ibid, P-189

(پرانے زمانے میں رسوم ورواج ہی قانون کا ماٰخذ تھے۔)

انسان چونکہ مدنی الطبع ہے اس لئے دوسرے حیوانات کی طرح وہ اپنی زندگی تنہا بسر نہیں کر سکتا بلکہ وہ فطرتاً عمرانی زندگی کی ترقی کے ساتھ ساتھ باہمی تعاون اور شرکت کے لئے مجبور ہے اور چونکہ ہر انسان سازگار ماحول چاہتا ہے اور اپنے حریف کے مقابلہ میں غضب کا اظہار کرتا ہے اس لئے بنی نوع انسان میں صحیح قسم کا عدل وانصاف اور نظام قائم رکھنے کی غرض سے ایسے قوانین کی ضرورت ہے جن کو شریعت کی تائید حاصل ہو۔

ابن خلدون نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ ''ان لاجتماع الانسانی ضروری'' یعنی انسان کے لئے اجتماعی زندگی ضروری ہے اور حکماء نے تمدن کی تعبیر ان لفظوں میں کی ہے ''الانسان مدنی الطبع'' انسان مدنی الطبع ہے۔ یعنی اس کے لئے اجتماعی زندگی ناگزیر ہے۔ جسے حکماء کی اصطلاح میں مدنیۃ کہتے ہیں اور جس کا دوسرا نام عمران ہے۔ نیز یہ کہ انسان اپنی زندگی کی تمام ضریات تنہا خود مہیا نہیں کر سکتا بلکہ نوع انسانی کی زندگی وبقا بلحاظ غذا ودیگر ضروریات زندگی کے سوسائٹی اور تعاون باہمی کے بغیر ممکن نہیں اور جب مل جل کر زندگی گزاری جائے تو اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ آپس مین لین دین کیا جائے اور ضروریات زندگی فراہم کرنے کے لئے ایک دوسرے سے مدد لی جائے چونکہ انسان کے جذبات حیوانی کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے کی طرف دست ظلم دراز کرے اور دوسرا اس کی مدافعت کرے اور اس صورت میں خونریز جنگ تک نوبت پہنچ جاتی ہے لہٰذا ایسی منضبط حالت میں ایک بااختیار حکم کے بغیر جو ظلم وتعدی کو مٹا کر عدل وعمرانی قائم کر سکے دنیا میں نوع انسانی کی بقا ممکن تھی۔[85]

رسم ورواج، مختلف ماہرین کے مطابق حق وصداقت، انصاف اور ناانصافی کے اُن مسلمہ اصولوں کو کہا جاتا ہے، جنھیں معاشرہ نے عرصہ دراز سے تسلیم کر لیا ہو جو طریقہ تمام لوگوں میں یا ایک فرقے میں مروج ہو وہ عادت یا رواج کہلاتا ہے۔ اقوام عالم کے نشو ونما اور ارتقاء کی تاریخ میں اور ان کی عمرانی زندگی اور تمدن کے تمام گوشوں میں رسم ورواج کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ اس میں دو چیزیں سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں، ایک ملکی آب وہوا اور دوسری قومی خصوصیات۔[86] قومی عادت اور رسم ورواج تقلید کے ذریعے سے مضبوط ہوتی اور پھیلتی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ تقلید ہی تمدن ومعاشرے کو قوموں میں نسل در نسل باقی رکھتی ہے۔ رسم ورواج حالات وزمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً الشاطبیؒ نے اپنے عصر میں ننگے سر

---

(85) ابن خلدون عبدالرحمن، مقدمہ ابن خلدون، (مصر: مطبع لعبیہ)، ص ۱۶۲، ۱۶۲، ۳۱۴، ۳۵۔۱۶۳

(86) مزید دیکھیے مونٹیسکو کی کتاب روح الشرائع، جزؤ اوّل، ج ۴۱

کے بارے میں کہا ہے کہ ننگے سر کا رواج دراصل ملک کے لحاظ سے مختلف ہے چنانچہ مشرقی ممالک میں ننگے سر رہنا اہل مشرق کے نزدیک ثقافت کے منافی ہے اور اہل مغرب کی نظر میں ثقافت کے خلاف نہیں۔[87]

رومی قوانین کی تاریخ میں قانون کا اصلی مآخذ و مصادر رسم و رواج ہی تھا۔ سب سے پہلے رسم و رواج کو بارہ تختیوں☆ میں تحریر کیا اور یوستنیانوس کے عہد تک وہی قانون جاری رہا۔ اس کا قول تھا کہ قانون غیر مدون رسوم وعادات سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس پر رواج عام[88] پسندیدگی کی مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے۔ نیز دنیا کے بیشتر ممالک کے اہم قوانین کا مآخذ رسم ورواج کو تسلیم کیا گیا ہے انگلستان میں کامن لاء(Common Law) انگریزوں کے مسلمہ رسم ورواج کا مجموعہ ہے برطانوی باشندے فطرتاً روایت پرست ہیں۔ اس لیے برطانوی آئین روایات کا حامل ہے۔ یہ روایات اور رسوم ضبط تحریر میں نہیں لائے گئے ہیں لیکن چونکہ یہ برسوں سے قائم ہیں، اس لیے ان کی اہمیت تحریری مسودات سے بھی زیادہ ہے۔ ان کی بنیاد پر ہی برطانوی آئین کو غیر تحریری کہا جاتا ہے۔[89]

برطانوی آئین کا اہم ترین حصہ رسم ورواج اور روایات ہیں جنھوں نے آئین کے طریقہ کار کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے اور بعض کو یکسر بدل دیا ہے۔ ان کو کسی قانون ساز ادارے نے پاس نہیں کیا ہے بلکہ یہ محض حالات کی دین ہیں مثلاً جارج اوّل و دوم چونکہ انگریزی زبان سے ناواقف تھے۔ اس لیے انہوں نے مجلس وزراء کی صدارت چھوڑ دی۔ لیکن یہ ایک نظیر بن گئی، جس کی آج تک تقلید کی جا رہی ہے۔ اسی طرح ایوان عام میں اکثریتی پارٹی کا رہنما وزیر اعظم ہو گا اور وہ ایوان کا اعتماد ختم ہو جانے پر مستعفی ہو جائے گا، کوئی بھی شخص ایوان کا اسپیکر منتخب ہونے کے بعد سیاست سے کنارہ کش ہو جائے گا وغیرہ۔ یہ سب روایات ہی ہیں، جن کی پابندی قوانین کی طرح کی جاتی ہے چونکہ یہ تمام روایات غیر تحریری ہیں اور برطانوی آئین کا زیادہ تر انحصار ان روایات پر ہے جو غیر تحریری ہیں اور انہی روایات نے آئین کو زندگی اور حرارت بخشی ہے۔ اوگ اور زنک کے الفاظ میں:

> "یہ قوانین کی سوکھی ہڈیوں پر گوشت چڑھاتی ہیں، آئین کو متحرک رکھتی ہیں اور بدلتی ہوئی سماجی ضرورتوں اور سیاسی خیالات کے مطابق اس میں ترمیم کرتی رہتی ہیں"۔[90]

---

(87) الشاطبیؒ، م۔ن، ص:۲ / ۲۸۴

(88) ☆ماخوذ کتاب الاحکام، تالیف یوستینانوس، بحوالہ محمصانیؒ م۔ن، ص:۱۴۱

(89) فاروقی، شجاع الدین، منتخب دساتیر کا تقابلی مطالعہ (دہلی: ترقی اردو بیورو)، ص:۳۴

(90) Ogg and Zink, Modern Foreign Governments, (New York, 1952), Ed:9th, P-29.

برطانیہ کے دستور کو غیر تحریری دستور کہا جاتا ہے۔ اور اس کی ایک بڑی وجہ برطانوی آئین میں روایات کی اہمیت اور عمل دخل ہے یہ روایات برطانوی قوم کے سینکڑوں برسوں کے تجربے کا نچوڑ ہیں۔

اوگ اور زنک کے مطابق:

"روایات ان مفاہمتوں، عادتوں یا طریقوں سے مل کر بنتی ہیں، جو محض سیاسی اخلاق کے اصول ہوتے ہوئے بھی بڑے سے بڑے عوامی اقتدار کے زمرہ کے تحت تعلقات اور کارکردگی کو بڑی حد تک متاثر کرتے ہیں۔"(91) لیکن روایات اور قانون میں درج ذیل فرق پایا جاتا ہے:(92)

(۱) قوانین پارلیمان بناتی ہیں، جب کہ روایات وقت اور حالات کی دین ہوتی ہیں۔

(۲) قوانین تحریری اور روایات غیر تحریری ہوتی ہیں۔

(۳) قوانین کا نفاذ عدالتیں کرتی ہیں، جب کہ روایات کی پابندی "رائے عامہ" کے ذریعہ دباؤ ڈال کر کی جاتی ہے۔

(۴) قوانین کو پارلیمان بدل سکتی ہے، جبکہ روایات وقت اور حالات کے مطابق بدلتی ہیں۔

سر آئیور جیننگس نے ان کے مابین فرق کو اس طرح بیان کیا ہے:

"روایات کسی آئین کے بالکل بنیادی اصولوں کی طرح ہیں۔ اس لیے کہ وہ عام لوگوں کی مرضی پر منحصر ہوتی ہیں۔ تحریری آئین محض اس لیے قانون نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کا تیار کردہ ہے بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ اس کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔"(93)

جان اسٹورٹ مل نے ۱۸۶۵ء میں تحریر کی گئی اپنی کتاب "نمائندہ حکومت" میں روایات کو آئین کے غیر تحریری اصول قرار دیا ہے ۱۹۱۰ء میں وزیر اعظم اسکوتھ (Asquith) نے ایوان عام میں کہا تھا کہ "ہمارا آئینی نظام روایات اور رسم ورواج پر قائم ہے۔"(94)

---

(91) Ibid, P-46

(92) فاروقی، شجاع الدین، م۔ن، ص:۳۷

(93) Jennings, Sir Ivor, The Law and the Constitution (Cambridge, 1954, Ed:4th, P.114).

(94) فاروقی، شجاع الدین، م ن، ص:۴۰

پروفیسر ڈائیسی (Dicey) نے مختلف مثالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"آئین کی روایات قانون نہیں ہیں ....، مگر جو کوئی انھیں توڑتا ہے، وہ قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے اور اسے قانون کی خلاف ورزی کی سزا ملتی ہے"[(95)]

بیکن (Bacon) رسوم ورواج کی قانونی اہمیت کو ان الفاظ سے اجاگر کرتا ہے:

"Since custom is the principal magistrate of man's life., let men by all means endeavour to obtain good customs.... if the force of custom simply and separately be great, the force of custom copulate enjoined is far greater." [(96)]

(جیسا کہ رواج کی حیثیت انسان کی زندگی میں ایک قابل ذکر منصف کی سی ہے، لہٰذا انسان کو اچھے رواج کے حصول اور تشکیل کیلئے سرگرداں رہنا چاہیے۔ اگر انفرادی حیثیت سے رواج کی اہمیت مسلم ہے، اجتماعی حیثیت سے ان کی اہمیت بدرجہ اولیٰ مسلم ہے۔)

لاویل (Lowell) [(97)] اور اوگ [(98)] نے روایات کی قانونی اہمیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

روایات کی پابندی خاص طور سے اس لیے کی جاتی ہے کیونکہ وہ ضابطہ تعظیم ہیں۔

الغرض برطانوی آئین میں روایات اور رسوم ورواجات نہایت اہم آخذ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنا آسان نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ایڈورڈ ہشتم جیسے مقبول شہنشاہ کو بھی روایات کے احترام کے طور پر تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑا۔ برطانوی آئین کے برعکس امریکی آئین تحریری اور غیر لچکدار ہے لیکن یہ بھی وقت اور زمانہ کے ساتھ ساتھ ترامیم اور دیگر طریقوں سے ارتقاء پذیر ہوتا رہا ہے، امریکی آئین کے بارے میں سابق صدر روڈرو ولسن نے کہا:

---

(95) Dicey, A.W, The Law of the Constitution, (London, 1959), Ed: 10th , P.451

(96) Fitzgeral, Ibid , P.236

(97) Lowell , A.L, The Government of England, (London), Vol.I, P.12

(98) Ogg, F.A, Quoted by Mahajan, V.D, Modern Government, (New York, 1962, Ed: 5th, P.14).

"American constitution is scarcely less than the British, a living and fecused system"[99]

یعنی (امریکی آئین بھی برطانوی آئین کی طرح زندہ وزرخیز ہے۔)

جارج واشنگٹن نے رسم ورواج کی قانونی مآخذ کی حیثیت سے اہمیت کو اس طرح اُجاگر کیا ہے:

"Time and habits are at least as necessary to the true character of Government as other human institution"[100]

(حکومت کا صحیح کردار طے کرنے میں وقت اور عادات کم سے کم اتنے ہی ضروری ہیں جتنے دوسرے انسانی اداروں کے لیے۔)

رسم وروایات امریکہ میں بے حد اہم ہیں۔ ان کی اہمیت وافادیت درج ذیل امثال سے بخوبی اُجاگر ہوتی ہے:

(۱) آئین میں سیاسی جماعتوں کے قیام کی پہلے صدر جارج واشنگٹن نے بے حد مخالفت کی تھی۔ لیکن آج امریکی نظام میں حکومت کو سیاسی جماعتوں کے بغیر سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ اور یہ سب روایات کی وجہ سے ہوا۔

(۲) آئین میں صدر کی کابینہ کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن روایات نے اب اس کو اتنا مستحکم کر دیا ہے کہ ان کے بغیر صدر اپنے اختیارات کا استعمال نہیں کر سکتا۔

(۳) یہ روایت بھی ہے کہ صدر اور نائب صدر، مختلف ریاستوں اور علاقوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ الغرض برطانیہ کی طرح امریکی آئین میں بھی رسم ورواج اور روایات ایک اہم مآخذ سمجھی جاتی ہیں۔

پروفیسر منرو کے مطابق:

"The constitution has been developed, expanded and modified by usages and customs. What habits is to the individual, usage is to the state .... so like a pyramid reared upon the written constitution

---

Wilson, Ibid, P.10 (99)

Ogg and Ray, Ibid, P.45 (100)

there has been built up in American a body of political customs and usages which have their basis neither in laws nor judicial decisions, but are merely the result of long continued habit".(101)

(آئین رسم ورواج کے ذریعے بڑھتا، ترقی کرتا اور اصلاح پاتا رہا ہے۔ فرد کی عادت ریاست کا رسم ورواج ہے۔ اس طرح تحریری آئین کے اُوپر ایک مخروطی مینار (Pyramid) کی مانند امریکہ میں سیاسی رسم ورواج قائم ہو گئے ہیں، جو محض قانون اور عدالتی فیصلوں پر ہی مبنی نہیں ہیں بلکہ ایک مستقل عادت کا نتیجہ ہیں۔)

پروفیسر جی۔ سی۔ لی (G.C.Lee) کی قانون کی تعریف سے رسوم کی قانونی حیثیت اُجاگر ہو جاتی ہے وہ کہتا ہے:

"Law is that body of customs, enforced by the community , by means of which man's gross passions are controlled and his conduct towards his fellow creatures regulated". (102)

(قانون معاشرے کی طرف سے نافذ کردہ رسوم ورواجات کا وہ مجموعہ ہے، جس کے ذریعے انسان کے سفلی جذبات کو قابو کیا جاتا ہے اور انسان کے ہم جنسوں کے ساتھ رویے کو مربوط کیا جاتا ہے۔)

5۔ فطری نظریہ (Natural Theory of law):

سرہنری سمنر مین "فطرت" (Nature) سے مراد مادی دنیا لیتے تھے جو ایک ابدی عنصر یا ابدی قانون کا نتیجہ تھی۔(103) جبکہ جارج ایڈورڈ مور کے مطابق فطرت سے میری مراد وہ چیز ہے جو طبیعی علوم، نیز نفسیات کا موضوع ہوتی ہے۔ اس کی بابت کہا جا سکتا ہے کہ اس میں وہ سب کچھ شامل ہے جو زمان میں وجود رکھتا تھا یا وجود رکھتا ہے یا وجود رکھے گا۔(104) جب اہل مغرب کسی شے کی فطرت کے بارے میں بات کرتے ہیں تو درج ذیل تین چیزوں میں سے کوئی ایک چیز مراد لیتے ہیں:(105)

---

(101) Munro, Ibid, P.72

(102) تفصیلات کے لیے دیکھئے: (i) Curzon , Ibid, P. 237-240, (ii) Fitzgeraled, Ibid, P.192-212 (iii) Paton, Ibid, P.190-194, (iv) Holland, Ibid, P.48-51

(103) ایضاً، ص:۴۲

(104) مور، جارج ایڈورڈ، اُصول اخلاقیات، مترجم عبدالقیوم، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء)، ص:۸۳

(105) ولیم للی، اخلاقیات، مترجم سید محمد احمد سعید (کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی، س۔ن)، ص:۱۷۵۔۱۷۷

(۱) اس سے ابتدائی یا اصل فطرت مراد لے سکتے ہیں، جس کا تعلق کسی شخص یا شے کی ان صفات سے ہوتا ہے۔ جو اس سے پہلے تاریخ کے کسی دور میں اس سے منسوب تھیں اور اسے اس وقت پہلی دفعہ موجودہ نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ روسو اور دیگر ماہرین اخلاق اس نظریہ فطرت کے قائل ہیں۔

(۲) کسی شخص یا کسی شے کی فطرت سے اس کی موجودہ حالت مراد ہوتی ہے۔

(۳) کسی شے یا کسی شخص کی فطرت سے ہم اس کی مثالی فطرت مراد لے سکتے ہیں۔

الف۔ مغربی تصور:

بعض مغربی مفکرین قانون اخلاق کو ہی قانون فطرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ سقراط کے مکتبہ ءخیال میں بھی یہ تصور پایا جاتا ہے اور رواقیئن نے بھی یہ نظریہ پیش کیا کہ نیک زندگی وہی ہے، جو فطرت کے مطابق ہے۔ کیونکہ فطرت ایک آفاقی قانون کے تابع ہے جو بنیادی طور پر عقلی ہے۔[106] یہ وہ علم ہے جس کو متقدمین یورپ قدرتی قانون یا قانون قدرت کہتے ہیں۔ اس سے اُن کی مراد اُصول انصاف قدرت تھی، یعنی انصاف مثالی، ایسا انصاف جو صرف انسان کے وہم و گمان میں موجود ہے اور جو اپنی مثال آپ ہو سکتا ہو۔ قدرتی اُصول قانون کو انگریزی میں مختلف الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے جیسا کہ سالمنڈ بیان کرتا ہے:

"This is also known as divine law, the law of reason, the unwritten law, the universal law, the common law and the eternal law".[107]

(اس کو الٰہی قانون، قانون عقل، غیر تحریری قانون، کائناتی قانون، عام اور ابدی قانون بھی کہتے ہیں۔)

مغربی مفکرین نے قدرتی اصول قانون کی مختلف انداز میں تعریفات بیان کی ہیں، کبھی تو وہ اس کو قانونِ فطرت کہتے ہیں اور کبھی قانون اخلاق کے لفظ سے اس کا مفہوم واضح کرتے ہیں۔ گویا کہ

"Natural law is now used to signify physical law".[108]

(قانون فطرت آج کل عملی قانون کی شناخت کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔) نیز یہ کہ

---

(106) ملی، م۔ن، ص:۱۷۷

(107) Salmond, Ibid, P.14

(108) Ibid, P.28

"By natural or moral law is meant the principles of natural right and wrong the principles of natural justice, if we use the term justice in its widest sense to include all forms of right full action." (109)

(قدرتی یا اخلاقی قانون سے مراد قدرتی حق وباطل کے اُصول یعنی قدرتی انصاف کے اصول ہیں، بشرطیکہ لفظ انصاف کا سب سے زیادہ وسیع مفہوم لیا جائے اور اس مفہوم کے لحاظ سے تمام قسم کے افعالِ جائز پر انصاف کا اطلاق کیا جاتا ہے۔)

اسی طرح کی قدرتی اُصول قانون کی تعریف ہابس(Hobbes)، ہل(Hill)، مارٹین(Maritain)وغیرہ نے بھی کی ہے۔ ایک اور مغربی مفکر تھامسس (Thomasius) اس کو "Divine Law" یعنی "خدائی قانون" کے طور پر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"Natural law is a divine law, written in the hearts of all men, obliging them to do those things which are necessarily consonant to the rational nature of mankind and to refrain those things which are repugnant to it". (110)

(قدرتی یا اخلاقی قوانین کو خدائی قوانین بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ قوانین ہیں جو خدا تعالیٰ نے انسان کے لیے بنائے ہیں اور تمام دنیا ان قوانین کو تسلیم کرتی ہے۔)

ارسطو کے مطابق دنیا بھر میں اخلاقی قوانین تقریباً یکساں ہیں اور بعض مقامات پر ان قوانین میں معمولی سا فرق ہو سکتا ہے۔ مثلاً کثیر الازدواجی (Polygamy) کو بعض معاشرے میں برائی تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض معاشرے اُسے دُرست تسلیم کرتے ہیں۔ جیسا کہ ارسطو کا یہ قول ہے:

"Law is either universal or special" (111)

(قانون کائناتی ہوتا ہے یا مخصوص)

---

(109) Salmond, (Glanville) Ibid, P.26

(110) Curzon, Ibid, P.49

(111) Glanville, Ibid, P.28

اہل یونان کے نزدیک قانون کو لازماً انصاف اور اخلاق فاضلہ پر قائم ہونا چاہیے، افلاطون نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "جمہوریہ" میں قانون اور انصاف کو مطابقت دینے کی از حد سعی کی ہے وہ چند مجرد اقدار پر ایمان رکھتا تھا اور قواعد قانون کی جانب سے ان اقدار کی تصدیق و توثیق کا طلب گار تھا، ارسطو نے قانون طبعی (Natural law) اور قانون ایجابی (Positive Law) کو الگ الگ ممیز کر کے پیش کیا۔ (112) بعض مفکرین قدرتی قانون کو طبعی قانون یا فطرتی قانون بھی کہتے ہیں۔ ان کے مطابق: قانون، آفاقی انصاف اور عقل و استدلال کے تقاضوں کی باہم دگر پیوست کرنے کا دوسرا نام ہے اور بدیں وجہ یہ قانون عقل انسانی کے نزدیک زیادہ واجب التعمیل قرار پاتا ہے۔ (113)

قانون طبعی کے نظریے کو ابتدائی عہد میں صلحاء اور راہبوں نے خوب فروغ دیا اور اس سلسلہ میں انہوں نے اس مقولہ کو بڑی اہمیت دی کہ انسان کو فطری انداز میں جینا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شے پر حکومت کا حق خود اُسی کے فطری تقاضوں اور رہنما اُصولوں کو پہنچتا ہے اور انسان کے لیے قدرت نے یہ رہنما اُصول اس کی عقل کی شکل میں پیدا کیے ہیں، لہٰذا انسان پر حکومت خود اپنی عقل کے زور سے ہی قائم کی جاسکتی ہے (114) لیکن بینتھم اور مل (Mill) بہت شدت سے قدرتی قانون (Natural Law) کی مخالفت کرتے ہیں ان کے خیال کے مطابق "احکام عشرہ" (Ten Commandments) بھی قدرتی قانون نہیں کہلاتے بلکہ انسان کے تحریر کردہ قانون تصور کیے جاتے ہیں۔ (115)

> "Bentham, regarded natural law as nothing , but a phrase, and natural rights as nonsense on stills". (116)

(بینتھم قانون فطرت کو ماسوا ایک جملہ کے کچھ نہیں سمجھتا اور فطری حقوق کو امدادی ذرائع گردانتا ہے / قرار دیتا ہے۔)

مصنف مزید کہتا ہے:

---

(112) خورشید احمد، ایم۔اے، قانون اور فلسفہء قانون، (چراغ راہ اسلامی قانون نمبر، حوالہ مذکور)، ص: ۳۴

(113) ایضاً، ص: ۴۴

(114) Bodenheimer, Ibid, P.164

(115) دیکھیے: Hart, Ibid, P.183-184

(116) مزید دیکھیے: (i) Bentham, A Fragment on Government, (London), Chap.4

(ii) Dennis, L Loyd, Introduction to Jurisprudence with Selected Texts, (Stevens & Sons, L.td, London, 1959), P.127-128

"Natural law reasoning resulted from confusing scientific laws with moral and legal laws."(117)

(قدرتی قانون کی عقلیت سائنسی قوانین کو اخلاقی اور آئینی قوانین کے ساتھ خلط ملط کرنے کا نتیجہ ہے۔)

قدرتی اُصولِ قانون کا ارتقاء :

قدرتی قانون کا نظریہ سب سے قدیم ہے۔ اس کا بموجب قانون آفاقی، کائناتی اور اخلاقی قدروں کو برقرار رکھنے والے اُصولوں کا نام ہے۔ قانون کا ماخذ ہمہ گیر اخلاقی اور کائناتی صداقتیں ہیں، جو قانونی نتائج کے اعتبار سے ساری بنی نوع انسان کے لیے یکساں افادیت کی حامل ہیں۔ اسی ہمہ گیری اور وسعت کے پیش نظر برک (Burk) نے تو انسان کے وضع کردہ قانون کا سلسلہ نسب قدرتی قانون یا قانون الٰہی سے ملایا ہے۔ قدرتی قانون درج ذیل چار ارتقائی مراحل سے گزرا ہے؛

(۱) فلسفیانہ عہد (۲) قانونی عہد (۳) مذہبی عہد (۴) موجودہ دور(118)

فلسفیانہ دور میں انسان نے پیدائش و موت کے علاوہ رنگ، نسل اور جغرافیائی تبدیلیوں کی یکسانیت سے قدرتی اُصول قانون کے نظریہ کو پروان چڑھایا۔ بعد میں افلاطون، ارسطو اور سٹائک (Stoics) نے قدرتی قانون کے فلسفیانہ نظریے کو مزید ترقی دی۔ ارسطو (Aristotle) کے نظریے کے مطابق:

"The natural law consists of those unwritten rules which are recognised among all men".(119)

(قدرتی قانون اُن غیر تحریری اُصولوں پر مشتمل ہے۔ جنھیں ہر شخص جانتا ہے۔)

ارسطو کے نظریے سے متاثر ہو کر سٹائک (Stoics) نے قدرتی قانون کے ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس طرح قدرتی اُصول قانون کے عہد کو بتدریج آگے بڑھایا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا:

"The universe was governed by a rational mind".(120)

---

(117) Ibid

(118) دیکھیے: (i) Fitzgerald, Ibid, P. 16-25 (ii) Dennis, Ibid, P. 53-61

(119) Glanville, Ibid, P.28

(120) Curzon, Ibid, P.52

(اس کائنات پر عقل سلیم کی حکمرانی رہی۔)

گلینولی ولیم قدرتی قانون کے ارتقاء کے حوالے سے اہل یونان کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:

"The natural law was conceived by the Greeks as a body of imperative rules imposed upon mankind by nature".(121)

(فطرت کی طرف سے بنی نوع انسان پر نافذ ہونے والے قوانین کا مجموعہ یونانیوں کا تخلیق کردہ ہے۔)

فلسفیانہ دور کے ساتھ ہی قانون کا عہد بھی شروع ہو گیا۔ روم کی ریاست میں دو قسم کے قانون نافذ تھے۔ (Jus civile) اور (Jus Gentium)، ان کی بنیاد بھی فطرت کے اُصولوں سے مطابقت رکھتی تھی۔ سٹائک کے بعد سسرو (Cicero) نے بھی قانون کے ضابطوں کو متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔(122) سسرو (Cicero) نے رواقیین کے نظریے کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

"There is indeed a true law (lex), right reason, agreeing with nature, diffused among all men, unchanging, everlasting.... It is not allowable to other this law, nor to derogate from it, nor can it be repealed. we can not be released from this law, either by the praetor or by the people, nor is any person required to explain or interpret it . Nor it is one law, at Rome and another at Athens, one law to-day and another hereafter; but the same law, everlasting and unchangeable, will bind all nations at all times; and there will be one common lord and ruler of all, even God the framer and propose of this law."(123)

(حقیقی قانون عقل صحیح ہے۔ جو فطرت کے مطابق ہے۔ اس کا اطلاق آفاقی ہے۔ یہ غیر متغیر اور جاوداں ہے۔ اس کے تقاضے فرائض کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کے امتناعات خطاکاریوں سے دور رکھتے ہیں۔ ہم

---

(121) Glanville, Ibid, P.27

(122) (i) Cicero, De Republica, III, P.22-23 (ii) L. Loyd, Ibid, P.70-71, (iii) Fitzgerald, Ibid, P.16

(123) (i) De Republic, III. P.22-23, (ii) Salmond, (Glanville), Ibid, P.28-29

سینٹ یا عوام کے ذریعے اس کی ذمہ داریوں سے آزاد نہیں ہوسکتے ہیں اور ہمیں اپنی ذات سے باہر اس کے مفسر یا شارح کی تلاش کی ضرورت نہیں ہے۔ قانون وہ شے نہیں ہے جو روم میں کچھ اور ایتھنز میں کچھ اور ہو بلکہ یہ دائمی یا تغیر ناپذیر ہے کیوں کہ یہ خدا کے حکم اور اقتدار اعلیٰ کا مظہر ہے۔)

قانون اخلاق کو قانون فطرت قرار دینے کا مؤقف عیسائی مفکرین نے بھی بعد میں پیش کیا۔ اور قرونِ وسطیٰ کے عظیم ترین مفکر سینٹ تھامس اکوائنس کے نظام میں قانون فطرت کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ اکوائنس کی تعلیم یہ تھی کہ قانون فطرت خدا کا مقرر کیا ہوا قانون ہے اور اس کا تعلق انسان کی سماجی زندگی سے ہے جو اس عالم واقعی میں زمانی و مکانی مخلوق کی طرح زندگی گزارتا ہے، جہاں اس کے سماجی روابط کو قانون الٰہی کے تحت منضبط ہونا ہے۔ قانون فطرت ایک حکم ہے۔ جسے صواب سے واسطہ ہے، یہ ایک ایسا حکم ہے۔ جو ذات باری تعالیٰ سے لازمی طور پر صادر ہوتا ہے اور یہ اشیاء کی ماہیت سے جس طرح کہ وہ ذات باری میں موجود ہے، غیر مبدّل طور پر معین ہے۔(124)

فلو جوڈیس (Philo Judaeus)، گائیس (Gaius) اور ہوکر (Hooker) نے بھی قدرتی قانون کے ارتقاء کے بارے میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے(125)۔ جسٹی نین کہتا ہے:

> "Natural law (Jura naturalia), which is observed equally in all nations, being established by divine providence remain forever settled and immutable, but that law which each state has established for itself is often changed, either by legislation or by the tacit consent of the people".(126)

(قانون فطرت، جس کو تمام اقوام انسانی مانتی ہیں اور جس کو مشیت ایزدی نے جاری کیا ہے، ہمیشہ سے نافذ ہے اور ازل تک بلا ترمیم و تبدیل ایک ہی طور پر نافذ رہے گا، لیکن وہ قانون، جس کو ہر ایک ریاست

---

(124) لی۔م۔ن، ص:۱۷۸

(125) دیکھیے: (i) Glanville, Ibid P.29, (ii) Institute I.1, (iii) Inst. Just- The Institutes of the Emperor Justinian. (A Text Book of Roman law for the use of students, compiled by order of Justinian, A.D.533, and forming part of the corpus Juris civilis), Div, I. 2.97.

(126) (i) Institutes, I.2.11 (ii) Glanville, Ibid, P.29

نے اپنے لیے بنایا ہے، وضع قوانین یا اُس ریاست کی کل رعایا کی رضامندی سے جب ضرورت ہو، بدلا جاسکتا ہے اور زمانہ سلف میں بھی اس قسم کے قانون میں بار ہا ترمیم ہوئی۔)

قانون فطرت کی ترویج واشاعت میں مذہبی تحریکوں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔یورپ میں عیسائیت کی تبلیغ سے قدرتی قانون کے فروغ کو بڑی مدد ملی۔ سینٹ پال(St. Paul) کی تعلیم کا یہ اثر ہوا ہے۔

"St. Paul had taught that conscience unaided could arrive at moral truths".(127)

(سینٹ پال نے یہ سکھایا تھا کہ ضمیر بغیر کسی امداد کے اخلاقی سچائیوں تک دسترس رکھتا ہے۔)

تھامس اکوائنس(Thomas Aquinas) کے مطابق :

"All things are governed by God's eternal law, man differing from all else in that he alone can choose whether or not to obey that part of the eternal law which applies to him".(128)

(تمام اشیاء پر خدا کے ابدی قانون کی عملداری ہے انسان ہر چیز سے مستثنیٰ ہو کر اس چیز کا انتخاب کرتا ہے کہ ابدی قانون کے کس حصہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے اس کا اپنے اوپر اطلاق کرنا ہے۔)

قدرتی قانون یا قانون الٰہی کا نظریہ، فلسفیانہ عہد، قانون کے عہد اور مذہبی عہد تک تو پروان چڑھا لیکن قرون وسطیٰ (Mediaval Period) کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتا چلا گیا اور یوں سارے یورپ میں مادی ترقی عروج پر پہنچ گئی۔ جس کی بناء پر لوگ اہل کلیسا سے منحرف ہو گئے اور اس طرح یورپ میں قانون فطرت یا قانون الٰہی کو ایک دائرے میں محدود کر دیا گیا۔اس تمام تبدیلی کے پیچھے ہابز(Hobbes)اور لاک(Locke) کا نمایاں کردار ہے(129)۔اس طرح قدرتی قانون میں پہلی سی شدت نہ رہی۔ مذہبی رہنماؤں کی اجارہ داری ختم ہوگئی اور قانون سازی کو ایک شعوری فعل تصور کیا جانے لگا۔

---

(127) Fitzgerald, Ibid, P.17

(128) (i) Aquinas, Summa, 1.2.q.91, Art. 1 (ii) L, Loyd, Ibid, P.76-79 (iii) Fitzgerald, Ibid, P.17

(129) تفصیل کے لیے دیکھیے: (i) Hobbes,Leviathan, (Cambridge university,Press,1904) Chaps 14-15 (ii) Locke, Treatise of Civil Government, BK.II, Part.2 (iii) L Loyd, Ibid, P.79-82 (iv) Hart, Ibid, P.189-195 (v) Curzon, Ibid, Chap 6-9,P.54-92.

لیکن قدرتی قانون کی دائمی قدریں پھر بھی بر قرار رہیں۔ مثلاً انگلستان کے قانون میں نصفتی (Equity) کے اُصولوں کی بنیاد قدرتی قانون کے اصولوں پر ہے اور انگلستان کے قانون بین الاقوام کی بنیاد بھی بڑی حد تک قانون قدرت پر ہے۔ گروشیس (Grotious) اور پفنڈرف (Puffendorf) کی تحریریں قانون قدرت کی پوری طرح نمائندگی کرتی ہیں، نیز اقوام متحدہ کے چارٹر کی بنیاد بھی قدرتی قانون پر رکھی گئی ہے۔[130]

دائمی قانونِ ربانی عقل الٰہیہ کا حکم ہے اور عقل انسانی کو جہاں تک اس قانون کا علم ہو سکتا ہے اسے قانون فطرت کہا جاتا ہے۔ دوسرے ذی حیات اللہ کے دائمی قانون میں اس حد تک شریک ہو سکتے ہیں، جس حد تک وہ اس کا جبلّی طور پر اتباع کرتے ہیں، لیکن انسان ازروئے علم اس میں شرکت کرتا ہے اور یہی دائمی قانون ربانی، جہاں تک عقل انسانی کو اس کا علم ہے، قانون فطرت کہلاتا ہے۔[131]

قانون فطرت کو قانون طبیعی (Natural Law) بھی کہا جاتا ہے۔ قانون طبعی، آفاقی انصاف اور عقل واستدلال کے تقاضوں کی باہم دگر پیوست کرنے کا دوسرا نام ہے اور بدیں وجہ یہ قانون عقل انسانی کے نزدیک زیادہ واجب التعمیل قرار پاتا ہے۔[132] قانون طبعی کے نظریہ کو ابتدائی عہد میں صلحاء اور راہبوں نے خوب فروغ دیا اور اس سلسلہ میں انھوں نے اس مقولہ کو بڑی اہمیت دی کہ انسان کو فطری انداز میں جینا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شے پر حکومت کا حق خود اُسی کے فطری تقاضوں اور راہنما اُصولوں کو پہنچتا ہے اور انسان کے لیے قدرت نے یہ رہنما اُصول اس کی عقل کی شکل میں پیدا کیے ہیں، لہٰذا انسان پر حکومت خود اپنی عقل کے زور سے ہی قائم کی جاسکتی ہے۔[133]

قانون طبعی، قانون فطرت کا یہ فلسفہ اس طریق پر پروان چڑھتا رہا۔ عہد وسطیٰ میں عیسائی علماء نے قانون فطرت کو مذہبی پہناوا دیا، لیکن زمانہ تجدید کے دوران اور مابعد اس میں لامذہبی رجحانات شامل ہوتے گئے۔ گوئٹے (۱۵۸۳ء۔۱۶۴۵ء) کے نزدیک قانون فطرت کی بنیاد انسان کی اپنی فطرت پر ہے اور اس کی اس اندرونی خواہش پر جو اسے سماجی زندگی بسر کرنے پر سدا اُکساتی رہتی ہے۔

---

(130) Salmond, Ibid, P.15

(131) للی، م۔ن، ص:۱۷۸

(132) خورشید احمد، م۔ن، ص:۱ / ۴۴

(133) Bodenheimer, Ibid, P. 164.

اس نظریہ کی ترویج کے ساتھ ہی فطری حقوق(Natural Rights) کے تقاضے اور نظریات بھی ایک ایک کر کے ابھرنے لگے، انقلاب فرانس نے اپنے نعرے اسی نظریہ سے حاصل کئے تھے، اور اٹھارہویں صدی میں جب امریکہ کے دستور مملکت کو تشکیل دیا گیا، تو اس میں زیادہ تر اسی نظریہ قانون فطرت کے جوہر کو سمونے کی کوشش کی گئی، یہ دور قانون فطرت کا گویا زریں دور تھا، چنانچہ اس کے آثار و شواہد جدید امریکہ کے فکر و نظر اور مکاتیبِ علم و فن میں بھی صاف نظر آتے ہیں۔ بوڈن ہیمر(Bodenheimer)کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ

کسی بھی فلسفہ قانون نے امریکی فکر اور امریکی اداروں کی تشکیل جدید میں اتنا حصہ نہیں لیا جتنا حصہ کہ اس معاملہ میں قانون فطرت کے نظریہ کی اس مخصوص شکل وہیئت نے لیا ہے، جو سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے دوران میں دنیا کے اندر رائج تھی۔[134]

انیسویں صدی کے آغاز میں قانون فطرت کے خلاف ایک رد عمل کے آثار بھی پیدا ہونے لگے۔ اس دور میں زیادہ زور قانون کے اصطلاحی مسائل یا اس کی مادّیانہ اصلاح کے پہلو پر دیا جانے لگا۔ نیز یہ کہ انیسویں صدی نے جہاں قانون کو ایک زبردست علم و فن کی حیثیت دے کر ایک عظیم ترقی سے ہمکنار کیا ہے۔ وہاں اس نے قانون کے ذرائع اور مقاصد کے بارے میں بھی کمال تہذیبی کے ساتھ کئی نئے علمی انکشافات و نظریات سے ہمیں فیض یاب کیا ہے۔[135]

بیسویں صدی میں انیسویں صدی کی ان مساعی کے خلاف رد عمل شروع ہو گیا، اور اس کی جگہ یہ احساس تقویت پکڑنے لگا کہ " ایک مکمل طور پر خود مکتفی علمِ قانون کا تصور محض ایک خوش فہمی ہو گا"۔ چنانچہ ہماری صدی کے اس مخصوص دور خلفشار میں، اب پھر قانون فطرت کی تجدید و احیاء کی کوششیں شروع ہو گئی ہیں۔

قانون فطرت سے متعلق تمام نظریات کا بنیادی خیال یہ عقیدہ معلوم ہوتا ہے، کہ کسی بھی معاشرہ کے افراد کے لئے قانون کا وجود زندگی کی بنیادی ضروریات میں شامل ہے اور چونکہ انسان ایک عقلیت پسند ہستی ہے، لہٰذا اس کے قانون کو بھی تقاضائے فطرتِ انسان کے مطابق عقل واستدلال پر مبنی ہونا چاہئے۔ قانون فطرت کے بارے میں دانشوروں کے ہاں دو بڑے بڑے تصوراتِ فکر خاص طور پر غالب نظر آتے ہیں، ایک تو یہ تصور، کہ تمام بنی نوع انسان ایک آفاقی نظام کی رعایا ہیں اور دوسرے یہ کہ فرد کے شخصی حقوق نا قابل اتلاف ہیں۔[136] لیکن زرخیز دماغوں کی اس شادابی فکر کے باوجود، یہ مسئلہ جوں کا

---

(134) Ibid.

(135) چیمبرز انسائیکلوپیڈیا، ص:۸/۴۴۳

(136) خورشید احمد، م۔ن، ص:۴۵

توں الجھنوں کا شکار ملتا ہے، ڈبلیو فرائڈمین نے اس موضوع پر کافی غور وخوض کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قانون فطرت کی ساری تاریخ، مجرد انصاف(Absolute Justice) کے بارے میں انسان کی زبردست مگر ناکام جستجو کی داستان پر مشتمل ہے، گزشتہ ڈھائی ہزار سالوں میں قانون فطرت کا نظریہ مختلف شکلوں اور صورتوں میں بار بار نمودار ہو چکا ہے، اور پھر اس کے ذریعے بنی نوع انسان نے بار بار ایجابی قانون سے کسی بلند تر اور مثالی و تصوراتی قانون کو اپنانے کی کوشش کی ہے، لیکن کچھ وقفے کے بعد خود انسان ہی نے اس تصوراتی قانون کو ترک و مسترد کر دیا اور یہ مسئلہ پھر وہیں کا وہیں رہ گیا، نوعِ انسانی کے سیاسی و عمرانی حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ قانون فطرت کے اصول و قواعد بھی بدل چکے ہیں لیکن اس ساری کشمکش میں ایک چیز البتہ علیٰ حالہ باقی ہے اور یہ ہے، ایجابی قانون سے کسی بلند قانون کے حصول کی خواہش۔۔۔ آج جس طرح انسان کی عمرانی زندگی اور سیاسی زندگی کے احوال وظروف کی نہایت آسانی سے ہنسی اُڑائی جاتی ہے، اسی طرح قانون فطرت کی ہنسی اڑانا بھی اس لحاظ سے آسان ہے کہ یہ ناانصافی اور ناقص زندگی کے چکر سے بنی نوع انسان کو باوجود انتہائی کوششوں کے نہیں نکال سکا لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کو بھی اس مسئلہ کا کوئی حل اب تک اس کے سوا نہیں مل سکا کہ وہ گاہ بگاہ ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف لڑھک جایا کرے۔[137]

فرائڈمین کا یہ تجربہ قانون فطرت کے مسئلہ کی ایک کافی صحیح تصویر پیش کرتا ہے اس نظریہ کی روشنی میں صاف ظاہر ہے کہ انسان اپنی مسلسل کاوش و جستجو کے باوجود قانون کے صحیح مقاصد حاصل کرنے میں اب تک کامیاب نہیں ہو سکا، اس نظریہ کو اگرچہ انقلاب پسند اور رجعت پسند دونوں گروہوں کے لوگوں نے اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ بنی نوع انسان کو اپنے قانون کی تشکیل کی خاطر کوئی صحیح اساس فراہم نہیں کر سکے۔

خلاصہ کلام یہ کہ قانون کے ارتقاء میں مختلف عوامل کارفرما ہوتے ہیں، لیکن مغربی اُصول قانون کے درج بالا نظریات سے یہ بات اُجاگر ہوتی ہے کہ ہر مکتبہ فکر نے اس ضمن میں صرف ایک ہی عنصر کی نشان دہی پر اکتفا کیا ہے، جو کہ درست نہیں ہے اور قانون کا وہی نظریہ درست ہو گا جو ان تمام نظریات کے صحیح اُصولوں کو یکجا کر کے تشکیل کیا گیا ہو۔ البتہ قانون پر رسوم و رواجات، مذہبی، ثقافتی اور عمرانی تصورات اثر انداز ہوتے ہیں۔

ب۔ اسلامی تصور:

قانون قدرت کے بنیادی اُصولوں کا آفاقی اُصولوں اور کائناتی صداقتوں سے گہرا تعلق ہے۔ دراصل قانون کے بنیادی اُصول، قدرتی اُصولوں اور قانون الٰہی کے تابع ہیں۔ بنی نوع انسان شعوری اور لاشعوری طریقہ پر ان قدرتی اُصولوں کے

Friedmanne, Ibid, P. 17-18 (137)

زیر اثر ہے۔ مغربی مفکرین نے قدرتی قانون کے لیے مختلف اصطلاحات استعمال کی ہیں مثلاً قدرتی قانون، قانونِ فطرت، قانونِ الٰہی، قانونِ طبیعیہ، قانونِ اخلاق وغیرہ جیسے مترادفات سے اس کو بیان کرتے ہیں۔ لیکن اسلام میں قانون الٰہی (Divine Law) ان سے ملتا جلتا ہے کیونکہ اس تعریف کے تحت یونیورسل نکات مشترک ہیں جو اسلام میں بھی پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں قانون فطرت (Natural Law) اور قانون قدرت (Law of Nature) دو مختلف اصطلاحات ہیں اور ان میں بنیادی فرق بھی پایا جاتا ہے۔ قانون قدرت سے مراد وہ خاصیت ہے جو قضائے قدرت نے اشیاء کے نظام میں رکھی ہے مثلاً یہ قانون قدرت ہے کہ پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے، آگ جلاتی ہے اور زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے اور اس میں کشش ثقل ہے، دل دھڑکتا ہے، خون رگوں میں گردش کرتا ہے، انسان ہوا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قانون قدرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

(لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ)(138)

"اور (ایک نشانی) آفتاب (ہے کہ وہ) اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے۔ یہ اندازہ باندھا ہوا ہے (اُس خدا) کا جو زبردست علم والا ہے اور چاند کے لیے منزلیں مقرر کیں، یہاں تک کہ ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی۔ نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور دونوں ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔"

جہاں تک قانون فطرت کا تعلق ہے۔ یہ اُن قواعد کا نام ہے جن کی پابندی کرنا مہذب قوم پر لازم ہے اور اس سے اطمینان قلب بھی حاصل ہوتا ہے، اسی کا نام صراط مستقیم ہے اور یہی دین فطرت ہے یعنی وہ قانون، جس کی پابندی کرنا اس طبیعت کے مطابق ہے جو پیدائش کے وقت انسان کو عطا ہوئی۔ اور انسان کو اختیار ہے کہ وہ اس پر عمل کرے یا نہ کرے مثلاً سچ بولنا، ماں باپ کی عزت کرنا، حق دار کا حق ادا کرنا، انصاف کرنا، خونِ ناحق سے بچنا وغیرہ قوانین فطرت ہےں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی قانون فطرت کی طرف اپنی توجہ اس طرح مبذول کرائی ہے:

(فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ)(139)

---

(138) یٰس ۳۶: ۴۰

(139) الروم ۳۰: ۳۰

مزید دیکھیے:

"سوتم یک سوہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف رکھو، اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو، جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو، جس پر اُس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے، بدلنا نہ چاہیے۔ پس سیدھا دین یہی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

خلاصہ بحث یہ ہے کہ قانون قدرت وہ ہے، جس سے انحراف ناممکن ہے اور نہ ہی اس کو بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس قانون فطرت پر عمل کرنا انسان کا اختیاری فعل ہے مثلاً اگر کوئی شخص اپنی گردن کاٹ دے تو وہ یقیناً مر جائے گا اگرچہ یہ قانون قدرت کا اٹل فیصلہ ہے لیکن یہ انسان کی اپنی مرضی ہے کہ وہ خودکشی کرے یا نہ کرے۔ فطرت یہ ہے کہ خودکشی نہ کی جائے اور قدرتی قوانین ایسے عالمگیر قوانین ہیں جو ہمیشہ انسان کی صحیح رہنمائی کرتے ہیں جبکہ رومیوں کا خیال تھا کہ صرف ان کے بنائے ہوئے قوانین ہی اقوام عالم کے لیے رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

ج۔ تقابلی جائزہ:

قانون کے متعلق جدید مغربی نظریات اپنی اصل کے اعتبار سے بحیثیت مجموعی، عہد قدیم کے یونانی فلسفہ اور اہل روما کے فلسفہء قانون اور قرون وسطیٰ کے فلسفہ اور زمانہ ما قبل تجدید (Post-Renaissance Period) کے لادینی اور مادی رجحاناتِ فکر کے ثمرات پر مشتمل ہیں نتیجتاً یہ نظریات بنیادی اعتبار سے چند متحارب اور متخالف نکتہء نظر کو بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر مکتبہ فکر اپنے مخصوص ادوار کی عکاسی کرتا ہے اور اپنے عہد کے رجحانات کو متعارف کرواتا ہے لیکن وقت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اُصول قانون کے نظریات میں بھی تبدیلی واقع ہوتی گئی اور یہ تبدیلی خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہی۔ تاریخی نظریہ کے حامی قانون کے بنیادی اُصولوں کا جائزہ تاریخی محرکات کی روشنی میں لیتے ہیں جبکہ عمرانی نظریہ قانون کا تعلق معاشرتی اداروں کے ساتھ منسلک کر کے اس کی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ بہر حال اُصول قانون کے نظریات کے حوالے سے مغربی قانون دانوں میں کافی حد تک اختلافات پائے جاتے ہیں۔

مغربی قانون کی طرح اسلام میں قانونی نظریات کی بھرمار نہیں ہے، اور مسلم مفکرین کا ایک ہی قانونی نظریہ ہے یعنی قانون اللہ تعالیٰ کا ہے جو اس نے قرآن حکیم کی شکل میں تا قیامت انسانی فلاح و بہبود اور ہدایت کے لیے نازل فرمایا اور یہی شریعت اور قانون کی اصل اور بنیاد ہے۔ اور مسلمانوں کا ایک اٹل قانون اور اساسی دستور ہے۔ قرآن پاک کا حکم قطعی اور واضح ہے۔ اس میں انسانیت اور فطرت کے وہ تمام ضابطے موجود ہیں جن میں ازل سے ابد تک کوئی تبدیلی ممکن نہیں اور تمام

Abul-A-la Maududi, West Versus Islam, (Islamic Publications (PVT), Lahore, (1992P. 45-60)

مسلمان اس نظریے پر ایمان رکھتے ہیں کہ حاکمیت اور مختارِ کل کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور وہی حقیقی مقنّن ہے اور اصل قانون ساز ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے :

(أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ) (140)

"یہ لوگ پھر کیا زمانہء جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور فیصلہ کرنے میں اللہ تعالیٰ سے کون اچھا ہو گا یقین رکھنے والوں کے نزدیک"۔

مغربی مفکرین خصوصاً جان آسٹن نے حکمیہ نظریہ پیش کر کے حاکم کو اختیار سونپ دیا کہ وہ قانون کا نفاذ جبراً کرواسکتا ہے۔ جبکہ اسلام میں اصل حاکم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے لیکن اس کے قانون ابدی میں جبراً تاکید کا عنصر نہیں پایا جاتا۔ یہ حکم الٰہی قرآن پاک کی شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل ہوا جس کا نفاذ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں شروع ہو چکا تھا۔

جان آسٹن نے تحکمانہ نظریہ (Imperative) کے تحت قانون کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ وہ حاکم اعلیٰ کا حکم ہے۔ اگر حاکم اعلیٰ سے مراد اسلامی مفہوم کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کو لیا جائے تو بلاشبہ یہ تعریف قانون کے اسلامی تصور پر پوری اُترتی ہے لیکن اگر حاکم اعلیٰ سے مراد کوئی دنیاوی فرمانروا ہو تو پھر یہ تعریف قانون کے اسلامی تصور پر صادق نہیں آتی۔ البتہ جزوی طور پر اس کی ایک نظیر اُصول فقہ میں ضرور ملتی ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی قانون حاکم وقت یا حکومت وقت کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ ایسے معاملات میں جہاں فقہاء کے درمیان اجتہادی اختلاف ہو اور کسی حکم شرعی کو سمجھنے اور اس کا مفہوم متعین کرنے میں متعدد آراء سامنے آئی ہوں، وہاں حاکم یا حکومت کسی ایک رائے کو اختیار کرنے کا حکم دے سکتے ہیں۔ اس صورت میں وہی رائے ملکی قانون کا درجہ اختیار کرے گی۔ جس کو حاکم وقت نے اختیار کرنے کا حکم دیا ہو۔ اس اعتبار سے یہاں اس محدود دائرہ میں حاکم وقت کا حکم قانون کی حیثیت اختیار کرے گا۔ (141)

کولسن (Coulson) معترف ہے کہ

---

(140) المائدۃ ۵ : ۵۰

(141) غازی، علم اصول فقہ ایک تعارف، ص:۲/ ۳۶

"It is a reasonable principle of historical enquiry that an alleged ruling of the Prophet (PUBH) should be tentatively accepted as such unless some reason can be adduced as to why it should be regarded as fictitious." (142)

(تاریخی جانچ کا یہ ایک معقول اصول ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کردہ کوئی فیصلہ عارضی طور پر قبول کرلیا جائے، جب تک کہ اس کے فرض ہونے کی سند یا حجت نہ مل جائے۔)

مغربی فلسفہ کے تحت قانون کے مختلف نظریات ہیں اور جو مختلف مفادات کا پیش خیمہ ہیں لیکن ایک عرصہ کے بعد ان کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی قانون کا نظریہ بہت جامع اور ہمہ گیر ہے اور دائمی اور یونیورسل ہے۔ جو کہ اسلامی تاریخی نظریے کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوا۔

اُصول فقہ کے مقابلے میں دوسری اقوام کے اصول قانون مرتب ہونے میں ہزارہا سال لگے۔ یہودی قانون کئی ہزار سال سے موجود ہے لیکن وہ تاحال کوئی ایسا مرتب و منضبط اصول قانون کا نظریہ پیش نہیں کر سکے جو اُصول فقہ کا مقابلہ کر سکے۔ یہی حال اہل مغرب کا بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی قانون قوانین عالم کی تاریخ میں وہ واحد قانون ہے جس میں روز آغاز ہی سے نظریات وتصورات کی پختگی اور اندرونی نظام کا کمال اس درجہ کا موجود تھا کہ جوں جوں قانون میں وسعت آتی گئی اُصول قانون بھی آپ سے آپ مرتب ہو تا چلا گیا او دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کا واحد اور پہلا علم اصول قانون کہلانے کا مستحق قرار پایا۔ ہم بلاخوف تردید یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری کے اواخر سے آئندہ آٹھ سو سال کا طویل عرصہ وہ ہے، جب اُصول قانون کے نام سے دنیائے علم وفکر میں ایک ہی سکہ کی حکمرانی تھی اور قلم روئے عقل و دانش اور مملکت عدل و انصاف میں ایک ہی فن کی فرما نروائی تھی اور وہ علم "اُصول فقہ" تھا۔ اس زمانے میں روئے زمین پر کسی اور قوم یا تمدن کے پاس سرے سے اصول قانون نام کا کوئی مستقل بالذات اور ترقی یافتہ فن موجود نہیں تھا۔ (143)

---

(142) Coulson, Noel.J, A History of Islamic Law. (Edinburgh, 1964), P. 65

(143) غازی، علم اصول فقہ، ایک تعارف، ص:۲/۲۴

مغرب میں آج کل "اصول قانون کا عمرانی نظریہ"، کو بہت مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ اس کا آغاز امریکہ میں ہوا لیکن جلد ہی یہ اصطلاح اور یہ تصور یورپ میں بھی بزبان عام ہو گیا۔ اور اس کا مجدد امریکہ کا روسکو پاؤنڈ ہے۔ روسکو پاؤنڈ (Roscoe Pound) کے مرتب کردہ اس معاشرتی جورس پروڈنس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کا کوئی طے شدہ اور متعین تصور نہیں جو اس نئے رجحان کی نمائندہ تمام تحریروں میں مشترک ہو۔ اس رجحان کا بنیادی مفروضہ ہی یہ ہے کہ قانون میں کوئی یکسانیت نہیں۔ یہ رجحان قانون کا مطالعہ کسی نظریہ یا اصول کے طور پر نہیں کرتا بلکہ قانون کو بر سر عمل دیکھتا ہے۔ لاءان ایکشن کے دلچسپ اور خوبصورت عنوان کے پردہ میں قانون کے کسی بنیادی اور مربوط نظریہ کا انکار مخفی ہے۔[144]
مغرب کے مطابق عمرانی نظریہء قانون کے دو بنیادی اوصاف ہیں:

(۱) کتابی قانون اور عملی قانون کے مابین خلیج سے بحث۔ گویا قانون کے بجائے قانون شکنی کا مطالعہ

(۲) زیادہ زور فطرتاً فوجداری قانون پر دیا گیا جہاں قانون شکنی کے مسائل زیادہ زیر بحث آتے ہیں۔

عمرانیاتی یا معاشرتی جورس پرورڈنس کے برعکس اسلامی جورس پروڈنس (اصول فقہ) میں عمرانیاتی یا معاشرتی انداز تحقیق کی گنجائش بہت کم بلکہ برائے نام ہے۔ اصول فقہ کی تو بنیاد ہی نصوص میں موجود دائمی اصولوں اور احکام پر ہے۔ اُصول فقہ کے قواعد واحکام کا غیر منفک رابطہ آخرت کی جواب دہی کے خالص مذہبی اور روحانی تصور سے ہے جبکہ معاشرتی اسلوب کا منطقی اثباتیت اور اخلاقی اضافیت کے غیر اسلامی عقائد سے گہرا تعلق ہے۔ یہ چیز اسلامی عقائد کے منافی ہے۔ اُصول فقہ میں اگر معاشرتی اسلوب تحقیق اور اجتماعی و عمرانی طرز مطالعہ کی گنجائش ہے تو محض اس حد تک کہ مجتہد اپنے اجتہاد کے عمل کے دوران زمینی حقائق وواقعات کا صحیح ادراک کرنے کے لیے اس اسلوب سے کام لے اور شریعت کی تنفیذ و تطبیق میں زمینی حقائق کا لحاظ رکھا جائے اور ان حقائق کی نشان دہی میں اس اسلوب سے کام لیا جائے۔[145]

اسی طرح سے فطری نظریہ قانون (Natural Law) کے ضمن میں مغربی مصنفین نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ قانون بطور ایک حکم عقلی کے کیا درجہ رکھتا ہے۔ نیچرل لاء کے یہ مباحث مغرب میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں زیادہ مقبول تھے لیکن بیسویں صدی میں ان کی اہمیت کم ہوتی گئی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کا زمانہ مغرب میں مذہب اور عقلیات پر شکستیں کھا رہا تھا۔ اور سائنس کے نام پر مادہ پرستانہ مفادات پر مبنی عقلیات کو پے در پے فتوحات حاصل ہو رہی تھیں۔ ان دنوں نیچرل لاء کی دہائی دونوں فریق بڑے زور وشور سے دے رہے تھے۔ اہل مغرب کا خیال تھا کہ وہ مذہبی تصورات واحکام کو

---

(144) ایضاً، ص:۲/۳۰

(145) ایضاً

قوانین فطرت(Natural Law) قرار دے کر ان کا دفاع کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف اہل سائنس یہ سمجھتے تھے کہ قوانین فطرت ہی دراصل سائنسی قوانین ہیں اور چونکہ سائنس نے اب قوانین فطرت کو حتمی طور پر دریافت کر لیا ہے لہٰذا اب ہر وہ چیز جو ان کے زعم میں قانون فطرت قرار پا گئی وہ حتمی ہے اور جو ان کی (اس دور کی) فہم و بصیرت کے لحاظ سے قوانین فطرت سے متعارض ہے، وہ غلط ہے۔ (146)

اس پس منظر کے تحت مغربی قانون دانوں نے نیچرل لاء کا نظریہ پیش کیا۔ جو کہ صرف ان کی تاریخ قانون کی حد تک محدود ہو کر رہ گیا۔ عملی زندگی میں یہ ناپید ہے۔ علمائے اصول نے مغرب کے اس پس منظر کی روشنی میں یہ بتایا تھا کہ کسی چیز کی اچھائی یا برائی اور اصول فقہ کی کتب میں اس کو تفصیلاً بیان بھی کر دیا ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی کے مطابق:

"جب ایک بار حتمی طور پر یہ طے ہو گیا کہ کسی چیز کے اچھے یا بُرے ہونے کا حتمی اور آخری معیار اللہ کی شریعت ہے تو یہ بات آپ سے آپ طے ہو گئی کہ ہر وہ نظریہ یا رائے جو شریعت کے طے شدہ قطعی اصولوں سے متعارض ہو وہ غلط اور ناقابل قبول ہے۔" (147)

الغرض مغرب کے مقابلے میں اسلامی نظریہء قانون ہر لحاظ سے مکمل اور جامع ہے۔ جو کہ ایک اللہ تعالیٰ کی اصل حاکمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ جو حاکمِ اعلیٰ اور قادر مطلق ہے اور لیس کمثلہ شی کا مصداق ہے۔

---

(146) غازی، علم اصول فقہ، ایک تعارف، ص:۲/ ۳۵

(147) ایضاً، ص:۲/۳۶

نتائج مقالہ

اس مقالہ میں پیش کیے گئے مواد کے تجزیے کے بعد درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ قانون سے مراد قواعد وضوابط کا وہ مجموعہ ہے جس سے کوئی ریاست یا معاشرہ اپنے اجتماعی نظم وضبط کو منظم کرتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے قانون سے مراد وہ قواعد وضوابط ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل کیے اور ان قواعد وضوابط سے مکلفین کے اعمال کو منظم کیا جاتا ہے۔

۲۔ اصول قانون سے مراد وہ قواعد وضوابط ہیں، جن کے ذریعے قانون سازی کے عمل کو منظم کیا جاتا ہے۔ کوئی بھی معاشرہ شائستہ اور تہذیب یافتہ نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس کے معاشرے میں قانون سازی کے قواعد وضوابط منظم طریقے سے موجود نہ ہوں۔

۳۔ مغربی اصول قانون کے تحت ان کے بادشاہ وقت اور پارلیمنٹ کے خود ساختہ انسانی قواعد وضوابط کا عمل دخل بخوبی نظر آتا ہے۔

۴۔ مغربی اصولِ قانون کے نظریات مختلف النوع ہیں۔ ان کے مفکرین میں ان کی قانونی حیثیت کے متعلق باہم اختلاف رائے پایا جاتا ہے اور ہر مکتبہ فکر اپنے مخصوص دور کی عکاسی کرتا ہے مثلاً حکمی نظریہ، عمرانی نظریہ وغیرہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

۵۔ قانون کے متعلق جدید مغربی نظریات اپنی اصل کے اعتبار سے بحیثیت مجموعی، عہد قدیم کے یونانی فلسفہ اور اہل روما کے فلسفہ قانون اور قرون وسطیٰ کے فلسفہ اور زمانہ ماقبل تجدید کے لادینی اور مادی رجحانات فکر کا پیش خیمہ ہیں۔

۶۔ اسلامی قانون میں نظریات کی بھرمار نہیں ہے اور مسلم مفکرین کا ایک ہی نظریہ قانون یعنی قانون الٰہی ہے جو کہ ایک اٹل قانون اور دستور اساسی ہے۔ جس کے تحت مقتدر اعلیٰ یا اصل قانون ساز صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ذات لافانی ہے۔

سفارشات

موضوع مقالہ کے حوالے سے درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ اصولِ فقہ اور معاصر نظام ہائے قانون و اصولِ قانون کا تقابلی مطالعہ ہونا چاہیے۔

۲۔ فقہ اسلامی اور اس کے متعلقہ علوم مثلاً تفسیر، اصولِ تفسیر، جرح و تعدیل، اصولِ فقہ، اشباہ و نظائر، قواعد کلیہ وغیرہ پر ہونے والا تمام سابقہ کام عربی زبان میں ہے جن کا انگریزی، اردو یا کسی اور زبان میں ترجمہ کیا جانا چاہیے، تا کہ ان ذرائع سے مکمل استفادہ حاصل کیا جاسکے۔

۳۔ جن کتابوں کا پہلے ترجمہ ہو چکا ہے وہ قدیم انداز کا ہے، لہٰذا نظر ثانی کر کے ان تراجم کو معیاری اور عام فہم بنایا جائے۔

۴۔ اردو اور انگریزی زبانوں میں بھی فقہ اسلامی اور اصولِ فقہ کے موضوع پر جدید اندازِ تحریر کے مطابق کتب تالیف کی جائیں۔

۵۔ جسٹس سر عبد الرحیمؒ کی طرح اصولِ فقہ کے مباحث کو انگریزی اصولِ قانون کے اسلوب میں بیان کرنے کی مزید ضرورت ہے تا کہ مغربی قانون دان، اسلامی قانون کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔

مصادر و مراجع

1. الآمدیؒ، ابو الحسین سیف الدین علی بن محمد، الاحکام فی اُصول الاحکام (قاہرہ: دارالمعارف، ۱۹۱۴ء)
2. الشلبیؒ، محمد مصطفیٰ، المدخل فی التعریف بالفقہ الاسلامی، (بیروت: دار النہضۃ العربیۃ، ۱۹۶۹ء)
3. البدخشانیؒ، محمد انور، اُصول الفقہ للمبتدئین، (کراچی: مکتبہ الیمان، س۔ ن)
4. پیٹن، جارج وائٹ کراس، ڈاکٹر، قانون کے جدید مکاتب فکر، (کراچی: چراغ راہ قانون نمبر، جون ۱۹۵۸ء)
5. مور، جارج ایڈورڈ، اُصول اخلاقیات، مترجم عبد القیوم، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء)
6. حسّان، حامد حسین، اصول فقہ (اسلام آباد: دارالصدق، ۱۹۹۹ء)
7. حمید اللہ، محمد، ڈاکٹر، نگارشات ڈاکٹر محمد حمید اللہ، (لاہور: بیکن بکس، ۲۰۰۴ء)
8. خورشید احمد، قانون اور فلسفہ قانون، (چراغ راہ، اسلامی قانون نمبر، حوالہ مذکور)
9. ابن خلدون عبد الرحمن، مقدمہ ابن خلدون، (مصر: مطبع لعبیہ)
10. ڈی، اولیری، فلسفہ اسلام، مترجم، احسان احمد، (کراچی: نفیس اکیڈمی، س۔ن)

11. الزرکشیؒ، بدر الدین محمد بن بہادر بن عبد اللہ (م۷۹۴ھ)، البحر المحیط فی اصول الفقہ، (بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۲۱ھ)

12. الزحیلیؒ، الزحیلی، وحبہ، اصول الفقہ الاسلامی(کوئٹہ، پشاور: مکتبہ رشیدیہ، س۔ن)

13. خلیفہ، مصطفی بن عبداللہ، کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون،(بیروت، لبنان: داراحیاء التراث العربی، س۔ن)

14. عبد المالک عرفانی، ڈاکٹر، مغربی قوانین کا تاریخی پس منظر، (ماہنامہ نوائے قانون، اسلام آباد، دسمبر ۱۹۳۹ء)

15. عمر رضا، معجم المولفین، (بیروت، دارصادر، س۔ن)

16. غازی، محمود احمد، علم اُصول فقہ ایک تعارف(اسلام آباد: شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،۲۰۰۲ء)

17. التھانویؒ، محمد بن اعلیٰ، (م ۱۷۷۷ء) کشاف اصلاحات الفنون،(خیاط، بیروت، س۔ن)

18. ابن ماجہؒ،ابو عبد اللہ محمد بن یزید (م۲۷۳ھ)، سنن ابن ماجہ، (داراحیاءالتراث العربی، بیروت، لبنان،س۔ن)

19. ابن الندیم، محمد بن اسحاق، الفہرست،(بیروت،لبنان: مکتبۃ خیاط،س۔ن)

20. ابن النجیمؒ، فتح الغفار اشرح، المتار محلاوی تسہیل الوصول لی علم الاصول،(مصطفی البابی الحلبی، مصر، س۔ن)

21. (نذرعابد،مرتبہ،مالک رام)،(نئی دہلی: مجلس نذرعابد،۱۹۷۴ء)

22. ابن سیناؒ، ابو علی الحسین بن عبداللہ، (م ۱۰۳۷ھ)، الشفائ، (الامیریہ القاہرۃ، ۱۹۵۲ء)

23. صدیقی، ساجد الرحمن، ڈاکٹر، کشاف اصطلاحات قانون(اسلامی)، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء)

24. الشاطبیؒ، (ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ بن محمد، الموافقات فی اُصول الشریعۃ،(مصر: مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ،۱۹۷۵ء)

25. مولانا شمس تبریز خان، مسلم پرسنل لاء اور اسلام کا عائلی نظام، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔۱۹۸۳ء

26. شبلی نعمانی، قانون یالائی،(ماہنامہ، الندوۃ، اگست ۱۹۰۹ء۔ نمبر۷)

27. اُردو جامع النسائیکلو پیڈیا

28. چیمبر۔اے،ایم، تاریخ دستور انگلستان، مترجم مولوی سید علی رضا،(دکن: جامع عثمانیہ، حیدر آباد۔۱۹۲۲ء)

29. فاروقی، شجاع الدین، منتخب دساتیر کا تقابلی مطالعہ (دہلی: ترقی اردو بیورو)

30. ابن القیمؒ، شمس الدین، محمد بن ابی بکر، (م۷۵۱ھ)، اعلام الموقعین عن ربّ العالمین، (دار الفکر، بیروت، لبنان، س۔ن)

31. ولیم للی، اخلاقیات، مترجم سید محمد احمد سعید (کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی، س۔ن)

English

1. Abul-A-la Maududi, West Versus Islam, (Islamic Publications (PVT), Lahore, 1992.
2. Bryce, Studies in History and Jurisprudence, Vol. 11
3. Bentham, A Fragment on Government, (London)
4. Coulson, N.J, Conflicts & Tention in Islamic Jurisprudence Chicago,1949
5. Coulson, Noel.J, A History of Islamic Law. (Edinburgh, 1964)
6. Curzon, L.B, A Dictionary of Law, (Mc Donald and Evans, 1979)
7. Chambers Biographical Dictionary, (Melanic Parry, Edinburgh, 1997),
8. Dias, R.W.M, Jurisprudence, (Butterworths, London, 1985), Ed:5th,
9. Dicey, A.W, The Law of the Constitution, (London, 1959), Ed: 10th
10. Dennis, L Loyd, Introduction to Jurisprudence with Selected Texts, (Stevens & Sons, L.td, London, 1959)
11. Encylopedia of Newzeeland, (Mc. Lintok, A.H, 1966)
12. London), Holland T.E, The Elements of Jurisprudence, (Oxford University Press
13. Hobbes,Leviathan, (Cambridge university,Press,1904)
14. International Encyclopaedia of the Social Sciences, (New York: The Mc Millan Company,
15. International Encyclopedia of Social Sciences, Vol, 9.
16. Jennings, Sir Ivor, The Law and the Consititution (Cambridge,1954, Ed:4th)
17. Lowell , A.L, The Government of England, (London), Vol.I
18. Maine's Early History of Institutions, Lect, 12
19. Nyazee, Imran Ahsan Khan, Theories of Islamic Law, Islamabad: Islamic Research Institute, 1991,
20. Ogg and Zink, Modern Foreign Governments, (New York,1952), Ed:9th
21. Ogg, F.A, Quoted by Mahajan, V.D, Modern Government, (New York, 1962, Ed: 5th)
22. Salmond, Sir John, Jurisprudence, (London, 1946), Ed: 10th,